مرتّب

محمد رضا انصاری

پہلی اشاعت ... ... ایک ہزار

صفحات ۱۲۸

قیمت : ... ... Price Rs. 8-00

تاریخ اشاعت ... ... نومبر ۱۹۵۷ء

ملنے کا پتہ

فرنگی محل "کتاب گھر" فرنگی محل لکھنؤ

فہرست

عرضِ مرتب

مجذوبؔ صاحب کی شاعری نے اردو ادب کو یا تصوف و معرفت کو کیا کچھ دیا اس کی تفصیل سے قطع نظر مجموعے کے مرتب پر اس کا سب سے بڑا احسان یہ ہو کہ ابتدائے شعور ہی میں شعر و شاعری کی لَو اس نے لگا دی جو ادب اور ادبیات کے باقاعدہ طالب علم نہ بننے کے باوجود بھی مرتب کو برابر روشنی بخشتی رہی۔

دلچسپی اور ذوق و شوق کے ساتھ سب سے پہلے ۱۲-۱۳ برس کے سن میں مجذوبؔ صاحب کے اشعار ہی سُنے اور اتنی دفعہ سُنے کہ ان کا بڑا حصہ ازبر ہو گیا۔

ایک دفعہ (غالباً سنہ ۴۳ئہ میں) مجذوبؔ صاحب سے کہہ بیٹھا تھا کہ "آپ کا مجموعہ اگر چھپا تو مجھے اس کے خریدنے کی ضرورت نہیں ہوگی، اس لیے کہ آپ کا آدھے سے زیادہ کلام تو مجھے زبانی یاد ہے۔"

مجذوبؔ صاحب نے برجستہ جواب دیا "تو اس سے قبل میں ہم کیوں نہ طے

کرلوں کہ مجھے مجموعہ کلام چھپوانے کی ضرورت ہی نہیں ہے جب آپ کا ایسا حافظ موجود ہے۔"

پھر مجذوب صاحب نے اپنا مجموعہ نہیں چھپوایا اور میری بے باک گفتاری کا حشر یہ ہوا کہ اُن کے مجموعہ کلام کا انتخاب پیش کرنا کاتب تقدیر نے میرے ہی نام لکھ دیا۔

مجذوب صاحب اور ان کی شاعری کے احسان کا حق ادا کرنے کی طرف پہلی بار توجہ عزیز دوست محمد طفیل صاحب (مدیر ماہنامہ نقوش لاہور) نے دلائی جب وہ اپنے رسالے کا شخصیات نمبر (حصہ دوم) مرتب کر رہے تھے۔ شخصیات نمبر کے لیے مضمون تیار ہوا تو میرے محترم اور ہمدم سید اکرام الحق صاحب (تاجر اسلحہ ۱۶ لاٹوش روڈ لکھنؤ) نے جو گھنٹوں مجذوب کے اشعار مجھ سے سُنا کرتے ہیں ترغیب دلائی کہ انتخاب کلام مجذوب کے ساتھ یہ مضمون الگ شائع کیا جائے طفیل صاحب نے بھی اجازت دے دی کہ ان کے خاص نمبر کا مضمون جو اخلاقاً ان کی ملکیت میں چلا گیا ہو علیحدہ کتابی شکل میں شائع ہو۔

اسی کے ساتھ خیال آیا کہ ۱۹۴۷ء میں مخدوم زادہ والا تبار مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ردولوی (ناظم دار المصنفین اعظم گڑھ) نے "وادیٔ ایمن" کے عنوان سے ایک بسیط مضمون مجذوب صاحب کی شاعری پر لکھا تھا، جو دار المصنفین کے ترجمان معارف میں شائع ہوا تھا، اس کو کلام مجذوب کے ساتھ شائع کرکے مجموعے کی افادیت اور برکت میں اضافہ کیا جائے۔

شاہ صاحب نے اپنے کرم سے پہلی تحریک پر ہی بخوشی اجازت عنایت فرمائی اور معارف کا وہ شمارہ بھی بھیج دیا جس میں یہ مضمون پہلی بار چھپا تھا۔

اس مجموعے کے محدود اوراق پورے مضمون کے متحمل نظر نہ آئے تو "کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ" کا سہارا لے کر شاہ صاحب کی تحریر میں حسب ضرورت مجموعہ ترمیم کی جرأت کی اور تقریباً چوتھائی حصہ تخفیف میں آگیا۔

حافظے پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ انتخاب کلام کا مرحلہ یادداشت کی بیاض سے بکھرے ہوئے اشعار چن چن کر کاغذ کے رشتے میں پروتا عملاً ناممکن ثابت ہوا۔ ایک وقت تھا کہ طلبگاروں کو مجذوب کے اشعار کی نقلیں بانٹا کرتا تھا، اور اس وقت ایک نقل بھی اپنے پاس نہ نکلی، عرصہ بھی تو کوئی بیس سال کا گزر گیا۔

انتخاب میں جتنی مدد یادداشت سے ملی، اس سے زیادہ عم محترم مولانا محمد شفیع حجت اللہ صاحب انصاری کی "بیاض اشعار مجذوب" سے ملی، نیز اس مجموعے نے بھی کام دیا جو کشکول مجذوب' کے نام سے سہارن پور سے شائع ہوا تھا، جو کتابت و طباعت کے نقائص کے ساتھ ترتیب اور تہذیب کی خامیوں کا بھی حامل تھا۔

انتخاب کے بارے میں دو باتیں قابل ذکر ہیں:۔

(۱) بچپن میں مجذوب صاحب کے اشعار پسندیدگی کے مختلف مدارج کے ساتھ جس طرح دلنشین ہو گئے تھے اس درجہ بندی میں آج بھی کسی بڑی تبدیلی کا احساس نہیں پایا، یہ ابتدائی نقوش کی 'کا لجری' (پتھر کی لکیر) معلوم ہوتی ہو۔ ممکن ہو بہت سے اشعار دوسروں کے لیے درجۂ انتخاب میں داخلے کے مستحق نہ ہوں، مگر انتخاب کرنے والا اپنی بے بسی کے علاوہ اور کوئی جواب نہیں رکھتا۔

(۲) وہ اشعار جو اب تک کہیں طبع نہیں ہوئے ہیں بہر حال انتخاب میں شامل

کیے گئے ہیں چاہے معیارِ انتخاب پر پورے نہ اتریں۔

شروع میں خیال رکھا گیا تھا کہ جو اشعار یا غزلیں "یادِ مجذوب" اور "کلامِ مجذوب" میں آ گئی ہیں ان کی "انتخابِ مجذوب" میں تکرار نہ کی جائے۔ اسی لیے دو غزلیں "ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی" اور "آ گئیں یاد وہ آنکھیں مجھے پیمانوں سے" انتخابِ کلام میں شامل نہیں کی گئیں کہ "یادِ مجذوب" میں درج ہو چکی ہیں، لیکن یہ پابندی قائم نہ رہ سکی، بہرحال مجذوبؔ صاحب کے کلام کا یہ انتخاب اگر شاہ صاحب کے مضمون "کلامِ مجذوبؔ اور مرتب کی تحریر "یادِ مجذوبؔ" میں مندرج اشعار کے ساتھ پڑھا جائے تو شاید کسی قسم کی کمی محسوس نہ ہو۔

فرنگی محل کے مشائخ اور مجذوبؔ صاحب کے مشائخ کے درمیان مسلک اور طریقے کا بڑا اختلاف بیان کیا جاتا ہے۔ بڑا اختلاف کیا ہے؟ ہم چھوٹے لوگ نہیں جانتے، بڑوں کی بات بڑے ہی جانیں، اس قدر ہم بھی جانتے ہیں کہ جب مجذوبؔ صاحب پر ان کے پیر و مرشد سخت پابندی لگا دیتے تھے کہ وہ نہ شعر کہیں نہ سنائیں اور نہ گنگنائیں تو یہ ہمارے مشائخ فرنگی محل ہی کی پاس خاطر کے لیے رعایت ہوتی تھی کہ یہاں سنانا پابندی سے مستثنیٰ رہتا تھا۔ اگر یہی اختلاف ہے تو پھر اس کے "رحمت" ہونے میں کس کو ادنیٰ سا بھی شک ہو سکتا ہے؟

"عبد الباری اکیڈمی" جو پیر و مرشد حضرت مولانا عبد الباری صاحب رحمۃ اللہ علیہ (فرنگی محلی) کے نام نامی سے موسوم ہے اپنے سلسلۂ مطبوعات کا آغاز "مجذوبؔ اور ان کے کلام" سے کر رہی ہے۔ جس کے لیے مرشد زادہ محترم مولانا جمال میاں صاحب کی اجازت حاصل ہو جانے پر مرتب کی مسرت کا اندازہ لگانا دشوار ہے۔

معظم مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی جنھوں نے اپنی شدید مصروفیتوں کے باوجود مسودے کو ملاحظہ فرمایا اور پسندیدگی کی سند عنایت فرمائی اس سے بہ رجہا بلند ہیں کہ شکریے کے حقیر الفاظ ان کی جناب میں پیش کیے جائیں ۔

سید اکرام الحق صاحب جو کتاب کی اشاعت کے محرک ہیں " الدال علی الخیر کفاعلہ " کے درجے سے آگے بڑھے اور اس طرح فعال بنے کہ مرتب کو ان کے مقابلے میں اپنی فاعلیت اور کارکردگی بہت حقیر نظر آئی ، وہی محرک تھے وہی ناظرین تک کتاب کے پہنچانے کے تمام مرحلوں کے کفیل بنے مرتب کے لیے ان کا شکریہ ادا کرنا کچھ غیر موزوں سا ہے ۔

محمد رضا انصاری
فرنگی محل ، لکھنؤ

چہار شنبہ ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۷۷ھ
۶ نومبر ۱۹۵۷ء

فرنگی محل لکھنؤ　　　　فون نمبر ۲۱۷۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عبد الباری اکیڈمی

(از مولانا محمد جمال الدین عبد الوہاب صاحب)

عبد الباری اکیڈمی کے قیام کا مسئلہ ایک عرصے سے وابستگان سلسلہ مولانا رحمت اللہ علیہ کے پیش نظر تھا، بڑی مسرت کی بات ہے کہ برادر مکرم جناب مولانا محمد رضا انصاری صاحب نے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا سامان کر لیا۔ ان کی سعی سے اس اکیڈمی کے عہدیداروں کا انتخاب ہو گیا اور کام بھی شروع کر دیا گیا۔ صدر مولانا محمد میاں فاروقی الہ آبادی (ممبر پارلیمنٹ) اور سکریٹری مولانا محمد رضا انصاری منتخب ہوئے ہیں۔

خواجہ عزیز الحسن مجذوب مرحوم کے کلام کے انتخاب اور حالات کے متعلق جو کتاب مولانا رضا صاحب نے مرتب کی ہے اس سلسلہ کی پہلی اشاعت کے طور پر پیش کی جا رہی ہے۔

اکیڈمی کے دائرے کی وسعت ظاہر کرنے کے لیے یہ ایک اچھی تدبیر ہے۔

امید ہے کہ مستقبل قریب میں وہ کتابیں بھی طبع ہو جائیں گی جن کا براہ راست رابطہ امام الوقت رحمۃ اللہ کی سیرت سے ہے۔

جمال

فرنگی محل لکھنؤ
۵ر نومبر ۱۹۵۷ء

بسم اللہ

"انتخاب لاجواب"

(از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی)

کلام مجذوب کی معنویت کی داد تو کوئی سالک ہی دے سکتا ہے۔ مجھ عامی کے لیے تو اتنا کافی ہے کہ کلام پرلطف ہے اور بہت ہی پُرلطف ____ اصلی لطف تو شاعر کی زبان سے اس کے سننے میں تھا، لیکن مطبوعہ صورت میں بھی لطف و کیف سے خالی نہیں، اور ہر شخص کا حصۂ لطف بقدر اس کے ظرف کے۔

رضا انصاری سلمہٗ نے یہ خوب کیا کہ اس کا انتخاب لاجواب شائع کردیا اور ان کا مفصل مقدمہ بھی اپنی دلکشی میں اصل کلام سے کچھ کم نہیں، مجذوب کی کرامت کہ اپنی محبوبیت "یاد مجذوب" میں بھی منتقل کردی!

اور پھر اس کی اشاعت 'عبدالباری اکیڈمی' کی طرف سے۔!۔۔۔ اس کے

سلسلۂ مطبوعات کی بسم اللہ! —— ایک ہی وقت میں ادب و معرفت دونوں کی خدمت!

یہ اکیڈمی جس جواں مرگ فرنگی محلی بزرگ کی یاد میں ہے، ناشکر گزار دنیا اس کے بھی کمالات و فضائل کو بھول گئی، یہ ہستی وہی ہے جس کے متعلق حضرت اکبر الہ آبادی نے سنہ ۱۹۲۰ء میں کہا تھا۔ع

کچھ کام کریں کچھ سعی کریں ہر شیخ کو عبد الباریؒ کر

عبد الماجد

دریاباد۔ بارہ بنکی

۲؍ نومبر سنہ ۱۹۵۷ء

یادِ مجذوبؔ

محمد رضا انصاری

شخصیت نگاری اور سوانح نگاری کے فرق کی بدولت مجذوبؔ صاحب کے شخصیت نگار پر یہ ذمہ داری عاید نہیں ہوتی کہ وہ ان کا سنِ پیدائش، عمر اور سالِ وفات وغیرہ کی تفصیل بھی بیان کرے۔ جن میں سے ایک چیز بھی بدقسمتی سے میرے علم میں نہیں ہے۔ سنِ پیدائش اور عمر کے معاملے میں تو بعض بڑی بڑی شخصیتیں گمنامی کا شکار پائی جاتی ہیں، لیکن کسی نمایاں شخصیت کا سالِ وفات نہ معلوم ہونا یقیناً جہالت ہے، اس جہالت کا مجذوبؔ صاحب کے بارے میں مجھے اعتراف ہے۔

عجیب اتفاق ہے، آخر جولائی یا شروع اگست ۱۹۴۲ء میں حیدرآباد کی ایک نجی صحبت میں جہاں کل ہند اردو کانگرس کے سلسلے میں حضرت جگر مرادآبادی کے ساتھ گیا ہوا تھا۔ مجذوبؔ صاحب کا، جن کے بیشتر اشعار مجھے یاد ہیں، ذکر آ گیا۔ جگر صاحب نے تفنناً کہا۔ "آپ کوئی دو شعر ان کے سنائیے، دیکھئے آپ کے ذوق کا

بھی امتحان ہے اس میں!"

ذوق کا ذکر جگر صاحب نے محض چھیڑنے کے لیے کیا تھا اس لیے کہ رسالۂ نیا ادب (لکھنؤ) سے میری وابستگی اور ماہنامۂ منزل (لکھنؤ) کی ادارت نے جگر صاحب کو جو "ترقی پسندوں کے ادبی ذوق" سے بدگمان سے رہتے تھے، میرے ذوق کا امتحان لینے کی دعوت دے دی۔ بہر حال دو شعر جو بروقت یاد آ گئے میں نے سُنائے ؎

گھٹا اُٹھی ہے تو بھی کھول زلفِ عنبریں ساقی
ترے ہوتے فلک سے کیوں ہو شرمندہ زمیں ساقی

یہ مطلع جس غزل کا ہے اس کا مقطع بھی ؎

الٰہی خیر ہو مجذوبؔ مے خانے میں آیا ہے
قدح کش، لاابالی، جامِ نازک نازنیں ساقی

دیر تک مجذوبؔ صاحب کا ذکر ہوتا رہا۔ دونوں میں سے کسی کو ان کے بارے میں صحیح علم نہ تھا کہ وہ اب کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ خط لکھنا مجذوب صاحب نے گویا سیکھا ہی نہیں تھا، حال معلوم ہو تو کیسے؟۔

واپسی پر کچھ دنوں کے بعد ایک دفعہ ضمناً مجذوبؔ صاحب کا ذکر آیا تو معلوم ہوا کہ اُن کا انتقال ہو چکا ہے۔ اپنے وطن اورئی ضلع جالون میں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تاریخ انتقال بھی اگست ۱۹۴۴ء کی کوئی تاریخ ہے۔ اس وقت ذہن پر زور دے کر حساب لگایا تھا اور، غالباً وہی تاریخ یا ایک آدھ دن آگے پیچھے کی تاریخ تھی جب حیدرآباد میں مجذوبؔ صاحب کی یاد ہم لوگوں کو آئی تھی۔

تاریخ انتقال مجھ کو یا دوسرے لوگوں کو نا معلوم ہونے کی وجہ کھلی ہوئی ہے کہ آخر زمانے میں مجذوب صاحب ایسی جگہ قیام پزیر ہو گئے تھے جو خبروں کی رہگزر سے دور پڑتی تھی۔ لیکن اس کی وجہ بتانا مشکل ضرور ہے کہ مجذوب صاحب کا ایسا شاعر جو شعراء کی درجہ بندی میں حسرت، جگر اور اصغر وغیرہ کے طبقے کا غزل گو تھا، عام طور پر نقادوں اور تذکرہ نویسوں کی نگاہوں سے کیوں پوشیدہ رہا۔

صفِ شعراء میں جب کبھی مجذوب صاحب کو دیکھا اساتذہ کے پہلو بہ پہلو دیکھا۔ اور جب "محفلِ یکتائی" میں انھیں پایا تو آتش بجاں مغنّی پایا۔ جب وہ "نالہ کناں" ہوتے تو اچھے سے اچھے شاعر خاموش سامع بن کر رہ جاتے۔ اس فضا میں جو مجذوب صاحب کی مترنم آواز اور بے چین جذبات سے ہمیشہ پیدا ہو جایا کرتی بڑے بڑے سخن شناس وارفتہ ہو جاتے یا گم صم اور سب اس دعوے کے موید نظر آتے۔

یہ معانی ، یہ حقائق ، یہ روانی ، یہ اثر
شاعری تیری ہے اے مجذوب یا الہام ہے؟

شاعر سب ہی "پیدائشی" ہوتے ہیں۔ اس لیے میں یہ نہیں کہتا کہ مجذوب صاحب "پیدائشی" "شاعر تھے"۔ لیکن یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ مجذوب صاحب سراپا شاعر تھے۔

یہ دعوی مجذوب صاحب کے بہت سے جاننے والوں کو محض دعویٰ نظر آئے گا جس کا بظاہر واقعیت سے کوئی تعلق نہیں، بیشک مجذوب صاحب ایک زمانے میں ڈپٹی کلکٹر رہے ہیں، پھر اس سے مستعفی ہو کر محکمہ تعلیمات (یو، پی) میں اسسٹنٹ انسپکٹر ہوئے۔ آخر میں انسپکٹر آف اسکولس کے عہدے پر پہونچ کر سبکدوش ہو گئے۔

مجذوب صاحب سخت قسم کے متشرع بھی تھے اور صوفی بھی، صوفی صرف شاعرانہ حد تک نہیں، بلکہ واقعتاً اپنے وقت کے ایک بڑے شیخ طریقت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مرید خاص اور خلیفہ بھی تھے۔ شیخ کے انتقال کے بعد خانقاہِ امدادیہ اشرفیہ میں متوسلین کے حالات و کوائف کے نگراں اور مشیر بھی۔

تو وہ مذہبی بھی تھے، صوفی بھی، سرکاری افسر بھی تھے اور سرکاری فہرستوں میں "خاں صاحب" اور "خان بہادر" بھی۔ پھر بھی میں انھیں سراپا شاعر کہنے کی جرأت کر رہا ہوں ـــــ شاعری اگر صرف قافیہ پیمائی کا نام نہیں، بلکہ اس کیفیت، اس شعور اور اس احساس کا نام ہے جو ہر شاعر میں کم و بیش پایا جاتا اور اس سے شعر کہلاتا ہے تو مجذوب صاحب پر یہ کیفیت اور یہ جذبہ ہمہ وقت طاری رہتا تھا۔ اگر ان کے دوسرے فرائض اس کیفیت کے اظہار میں رکاوٹ بنتے تو ایک سخت قسم کی بے چینی ان کے ہر بن مو سے ٹپکتی دکھائی دیتی تھی۔ اس بے چینی کو محسوس کرنے والا پوری طرح جان لیتا تھا کہ اس میں نہ بناوٹ ہے اور نہ دکھاوا۔

ہم دو تین "صاحبزادگان" فرنگی محل (بہ لحاظ عمر نہ بغرض احترام) مجذوب صاحب کی تلاش میں ان کے مکان واقع بنارسی باغ مغرب کے بعد پہونچے، ۱۹۳۸ء کے آس پاس کی بات ہو گی، اس وقت مجذوب صاحب انسپکٹر آف اسکولز ہو چکے تھے اور خاں صاحب خواجہ عزیز الحسن غوری انسپکٹر آف اسکولز (یو۔پی) کہلاتے تھے۔ مکان یعنی سرکاری بنگلے میں وہ ملے نہیں، معلوم ہوا کہ نماز پڑھنے گئے ہیں۔ دیر تک ہم نے ٹہل ٹہل کر انتظار کیا آخر اس مسجد تک پہونچ گئے جہاں وہ نماز پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ وہ مسجد کے صحن میں دو زانو بیٹھے ایک طرف گردن ڈھلکائے اور اسے شانے پر ٹکائے تسبیح پڑھ رہے تھے۔

تسبیح ان کے ہاتھ میں تھی اور پڑھنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بالکل قریب جاکر سنا تو وہ گنگنا رہے تھے ؎

پروانہ ہے، بلبل کا سا انداز نہیں ہے
جاں باز ہے مجذوبؔ سخن ساز نہیں ہے

کیا مسکنت اور کیسی عاجزی تھی ان کی آواز میں! یہی جی چاہا کہ جس بے نیاز کو وہ اپنی سچائی کا یقین دلا رہے ہیں اس کے سامنے پہونچ کر ہم سب مجذوبؔ صاحب کی صداقت کی فوراً گواہی دیں مگر وہ تو "عالم السّر والشہادۃ" سے مصروفِ راز و نیاز تھے۔ جس کے سامنے سوگند اور گواہ کی حاجت ہی نہیں ہوتی۔

عربی زبان میں ایک لفظ "حنین" ہے جس کے معنی کسی کے شوق میں بیقراری کے ہیں مجذوبؔ صاحب ہمہ تن اشتیاق اور سراپا شوق تھے، نماز میں ہوں، سرکاری کام میں ہوں، خالی بیٹھے ہوں، یا انجمن میں ہوں، لَو ایک ہی لگی رہتی تھی، مجذوبؔ نہ تھے استن حنّانہ تھے، انھوں نے خود کہا تھا۔ ع

غمِ فرقت میں ہوں میں استنِ حنّانہ برسوں سے

"استن حنّانہ" مسجد نبویؐ کے ایک درخت کا تنا تھا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وعظ اور خطبہ دیتے وقت سہارا لیا کرتے تھے۔ پھر مسجد نبویؐ میں منبر بن گیا اور آپ اس پر کھڑے ہو کر خطبہ دینے لگے، کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ کی جدائی درخت کے اس تنے کو بہت شاق گذری اور لوگوں نے اس لکڑی سے "حنین" (صدائے اشتیاق) سُنی۔ اسی لیے اس کو استنِ حنانہ یا "نالہ کناں ستون" کہا جاتا ہے۔

مجذوبؔ صاحب تھے بھی تو ستون کی طرح دراز قد! استنِ حنانہ" کی تشبیہ ان کے

ظاہر و باطن دونوں کے عین مطابق تھی۔

مجذوب صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز ہو کر لکھنؤ میں متعین ہوئے تو ان کا قیام وکٹوریہ اسٹریٹ پر ہوا۔ یعنی ہمارے اور ان کے گھروں کے درمیان صرف ایک سڑک حائل تھی۔ یہ نہیں معلوم اور نہ میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ کب سے ہمارے پڑوسی تھے۔ لیکن ۱۹۲۲ء یا ۱۹۲۳ء میں پہلے پہل ان کا ان کی شاعری اور ان کی والہانہ زندگی کا ذکر اپنے چچا مولانا صبغت اللہ شہید صاحب کی زبانی سُنا جو ایک دوسرے عزیز سے کہہ رہے تھے اور میں اپنے ساتھیوں سمیت نحو میر یا فصول اکبری کا سبق پڑھنے بیٹھا ہوا تھا۔

انھوں نے کہا کہ "سڑک پر ایک ہجوم دیکھ کر میں اس طرف بڑھا تو دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب کھڑے جھوم جھوم کر اور رقص کر کر کے گا رہے ہیں، مجھے دیکھ کر چونکے اور بولے "آئیے آئیے آپ حضرات اہل علم ہیں۔" میں قریب چلا گیا۔ وہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک کبھی اس غزل کے اور کبھی اس غزل کے اشعار بلا لحاظ ترتیب سناتے رہے۔"

عجیب و غریب "تعارف" تھا یہ! سڑک پر ایک آدمی جھومے ناچے! یہاں یہ تربیت دی گئی تھی کہ اکیلے سڑک پر نہ جاؤ۔ کسی سے سڑک پر بات نہ کرو۔ شیروانی کے بغیر گھر سے قدم نہ نکالو، سودا خود نہ خریدو، وغیرہ وغیرہ۔ بڑا زبردست تضاد تھا ہماری معاشرت اور اس شاعر کے طور طریقوں میں! ایک ولولہ سا اٹھا ایسے آدمی سے ملنے کا، اس کی شاعری کے شوق میں نہیں، ۱۳ برس کی عمر اور نحو میر کی استعداد رکھتے کس کو شاعری کی سوجھ بوجھ ہو سکتی ہے؟۔ اس عجیب و غریب شخصیت کو دیکھنے کی گدگدی ضرور ہوئی۔ جب یہ معلوم ہوا کہ آج رات کو وہ آئیں گے اور ایک نشست ہو گی تو ہم خوش

ہو گئے۔

گرمی کا موسم تھا، مجذوب صاحب آٹھ ساڑھے آٹھ بجے رات کو آ گئے، ہم کو سبق یاد کرنے اور مطالعہ دیکھنے کے بعد ہی اجازت ملی۔ فرّاٹے بھر کر مجذوب صاحب کو دیکھنے پہونچ گئے۔

دیکھا کیا؟ گورا چٹّا لمبی سفید داڑھی والا آدمی، سر پر شاہ صاحبوں والی چوگوشیہ ٹوپی، پرانے ڈھنگ کا لمبا کرتا، جس میں بائیں سینے سے متصل گھڑی اور قلم وغیرہ رکھنے والی جیب جو لکھنؤ کے خوش پوشاکوں کے ذوق پر ہمیشہ بار رہی، آستینوں اور دامنوں میں لیس ٹکی ہوئی، تخت پر بیٹھا دونوں ہاتھ اٹھائے داہنے بائیں جھوم جھوم کر ایسے انداز میں شعر پڑھ رہا ہے کہ شاعر کے ساتھ سامعین بھی جھوم رہے ہیں اور کبھی کبھی چیخ پڑتے ہیں۔ ہوں گے سب ملا کر ۱۵۔ ۱۶ سننے والے جن میں زیادہ تعداد علمائے فرنگی محل کی تھی، چھوٹی پود سب سے پیچھے ایک پلنگ پر بیٹھ گئی، میں پنسل کاغذ لے کر گیا تھا اشعار نوٹ کرنے، یہی سوچا کہ جس شعر کی زیادہ تعریف ہو اس کو لکھ لو۔ مگر ایک شعر بھی ایسا نہیں تھا جس پر اہل علم سامعین نے جی کھول کر تعریف نہ کی ہو، کم از کم رسمی تعریف اور واقعی تعریف کا فرق میں اس وقت بھی سمجھ سکتا تھا۔

مجذوب صاحب پڑھ رہے تھے۔

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی	اب تو آ جا اب تو خلوت ہو گئی
دل میں دعووں کی یہ کثرت ہو گئی	رونما اک شانِ وحدت ہو گئی
یاس ہی اب دل کی فطرت ہو گئی	آرزو جو کی وہ حسرت ہو گئی
سوگ میں یہ کس کی شرکت ہو گئی	بزمِ ماتم بزمِ عشرت ہو گئی

پڑ گئی تھی ان پہ بھولے سے نظر — بات اتنی سی؛ قیامت ہو گئی
ایسی ضد کا کیا ٹھکانا ہے بھلا — بات جو کہہ دی وہ قسمت ہو گئی
جی رہا ہوں موت کی امید میں — مر ہی جاؤں گا جو صحت ہو گئی
رنج دینے سے وہ باز آئے تو کب — جب کہ غم کھانے کی عادت ہو گئی
خاک میں کس نے ملایا یہ تو دیکھ — شکر کر مٹی سوارت ہو گئی

کر چکے رندی میں اب مجذوب تم
ایک چلو میں یہ حالت ہو گئی؟

ظاہر ہے کہ مذکورۂ بالا سب ہی اشعار ایک درجے کے نہیں یا سب بلند پایہ اشعار نہیں کہے جا سکتے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب مجذوب صاحب خود سنا رہے ہوں تو بڑے سے بڑے منکر کے لیے بھی ممکن نہیں کہ وہ اس کیفیت میں جذب ہو کر جو خود مجذوب صاحب پر طاری رہتی تھی، ایک ایک شعر پر سر نہ دھننے لگے۔

ذرا اے ناصحِ فرزانہ! چل کر سُن تو دو باتیں
نہ ہو گا پھر بھی تو مجذوب کا دیوانہ؟ دیکھوں گا!

مجذوب صاحب کے پڑھنے کا انداز بالکل نرالا تھا۔ ٹھیک وہی جس کی طرف میر سوز کے تذکرے میں شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں اشارہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:-

"انھوں نے (میر سوز نے) علاوہ شاعری کے شعر خوانی کا ایسا طریقہ ایجاد کیا تھا کہ جس سے کلام کا لطف دوچند ہو جاتا تھا۔ شعر کو اس طرح ادا کرتے تھے کہ خود مضمون کی صورت بن جاتے تھے۔ اور لوگ بھی نقل

آتارتے تھے ، مگر وہ بات کہاں ؟ آواز دردناک تھی ، شعر نہایت نرمی اور
سوز و گداز سے پڑھتے تھے ، اور اس میں اعضاء سے بھی مدد لیتے تھے ، مثلاً
شمع کا مضمون باندھتے تو ایک ہاتھ سے شمع اور دوسرے سے اوٹ دے کر
فانوس تیار کر کے بتاتے ، بے دماغی یا ناراضی کا مضمون ہوتا تو خود بھی
تیوری چڑھا کر وہیں بگڑ جاتے ۔"

آگے چل کر میر سوز کے بارے میں آزاد نے جو بات لکھی ہے وہ وہ ہو جو مجذوب
صاحب کے بارے میں میرے دل میں تھی . مگر مجھے اس مفہوم کے اظہار کے لیے موزوں
الفاظ نہیں ملتے تھے ، آزاد لکھتے ہیں :۔

" تم خود خیال کر کے دیکھ لو ان کے اشعار اپنے پڑھنے کے لیے ضرور
حرکات و انداز کے طالب ہیں "۔

مجذوب صاحب کے اشعار " حرکات و انداز " کے کہاں تک طالب ہیں ؟ ممکن ہو
یہ بحث طلب مسئلہ ہو ، لیکن ان کے حرکات و انداز سے شعر کا اثر یقیناً دوچند ہو جاتا تھا ۔ یہ
تجربے کی بات ہے ۔

ایک دفعہ حضرت جگر مرادآبادی نے مجذوب صاحب کے مجموعۂ کلام کے بارے
میں بالکل یہی بات مجھ سے کہی ۔ انھوں نے مجذوب صاحب کو مولانا مجذوب کہہ کر یاد کیا
اور کہا ۔ " دیکھیے مولانا کا یہ مجموعۂ کلام کیسا بے جان نظر آ رہا ہے ، اصل بات یہ ہو کہ مولانا
کے اشعار میں مولانا کے حرکات اور ان کی بے چینی کو جب تک شامل نہ کیا جائے صحیح
معنوں میں ان سے لطف اندوز نہیں ہوا جا سکتا ۔ "

اشعار سنانے میں میں نے مجذوب صاحب کو بیہوش ہوتے یا غش کھاتے تو

نہیں دیکھا۔ جس طرح بقول مولانا آزاد "میر سوز نے ایک خاص موقعہ پر عجب انداز سے حسب ذیل قطعہ پڑھا۔

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے　　سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے

وہاں دیکھے کئی طفلِ پری رو　　ارے رے رے ارے رے رے ارے رے

چوتھا مصرعہ پڑھتے پڑھتے وہیں زمین پر گر پڑے گویا پری زادوں کو دیکھتے ہی دل بے قابو ہو گیا ہے اور ایسے نڈھال ہوئے کہ ارے رے رے کہتے کہتے غش کھا کر بیہوش ہو گئے۔"

لیکن مجذوب صاحب کے حرکات و سکنات بھی کچھ اسی طرح کے، غزل سنا رہے تھے "کہیں ہوتی" "نہیں ہوتی" جب یہ شعر پڑھا ؎

ہٹاتے ہم نشیں ہر چند لیکن چشم گریاں پر
کبھی یہ آستیں ہوتی کبھی یہ آستیں ہوتی

تو پہلے داہنی آستین چشم گریاں پر رکھ لی، پھر گویا ہم نشین نے ہاتھ ہٹا دیا تو بائیں آستین اس کی جگہ رکھ لی۔

ایک دفعہ یہ شعر پڑھا ؎

ہنس بھی دو ہنس بھی دو، ہاں ہاں چلو بس روٹھ چکے
اب ہنسے، اب ہنسے، دیکھو وہ ہنسی آئی ہے

"دیکھو وہ ہنسی آئی ہے" جب بھی کہا اس طرح کہا کہ جس کی طرف انھوں نے اشارہ کیا اس کو ہنسی آ کے رہی۔

انھوں نے جب سنایا ؎

کسی کی یاد میں بیٹھے جو سب سے بے غرض ہو کر
تو اپنا بوریا بھی پھر ہمیں تخت سلیماں تھا

تو اپنی نشست پر اس طرح اکڑ کر بیٹھ گئے جیسے واقعی تخت سلیمان پر بیٹھے ہیں۔

یا جب یہ شعر پڑھا ؎

اٹھاؤں گا نہ زانوے میں ہرگز اپنا سر ہمدم
ارے میں اپنی آنکھوں سے انھیں جاتا نہ دیکھوں گا

تو اس قدر جھک گئے کہ واقعی سر بہ زانو نظر آنے لگے۔

مجذوبؔ صاحب کی یہ پہلی نشست تھی ہمارے یہاں۔ میں سامع سے زیادہ منشی بن کر اس میں شریک ہوا تھا، وہ خود ہر شعر دو تین بار پڑھتے تھے اور بیشتر اشعار ان سے بار بار پڑھوائے جاتے۔ مجھے نقل کرنے میں کوئی زحمت نہیں ہوئی، ۸ بجے رات سے مجذوبؔ صاحب نے سنانا شروع کیا تھا۔ نہ وہ سنانے سے تھکے اور نہ سننے والے سننے سے، فجر کی نماز کے وقت بادلِ ناخواستہ محفل برخواست ہوئی اور سننے والے ایک تشنگی لے کر اٹھے۔

محفل برخاست ہونے کا مطلب پڑھنے والے جو سمجھے وہ یقیناً صحیح نہیں ہے، مجذوبؔ کی محفل نرالی شان سے برخاست ہوتی تھی، مثلاً فجر کی اذان ہوئی سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے کہ نماز کی تیاری کریں۔ مجذوبؔ صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے مگر گنگناتے اور شعر سناتے، جوتا پہن رہے ہیں اور شعر سنا رہے ہیں، گھر سے نکل رہے ہیں اور گھوم گھوم کر شعر سنا رہے ہیں۔ کچھ بڑے اور باقی لڑکے ان کی مشایعت کو تھوڑی دور گئے۔ مجذوبؔ صاحب شعر سناتے چلے جا رہے ہیں اور اگر دو دن پر ہیں تو راستے میں کھڑے ہو جائیں

گے اور سناتے رہیں گے ۔ مشایعت کرنے والوں کو ان کے اشعار کشاں کشاں ان کے گھر تک پہونچا دیں گے ۔ جب تک گھر کا دروازہ کھلے مجذوب صاحب سناتے جائیں گے یہاں تک کہ وہ گھڑی دیکھ کر ایک دفعہ زور سے استغفراللہ کہیں گے گویا نماز کا وقت تنگ ہوتا جا رہا ہے اور جلدی جلدی اپنے مکان کے زینے پر چڑھ جائیں گے ۔ اس طرح محفل برخاست ہوتی تھی ۔ ایک دو بار کی بات نہیں ہے ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ مجذوب صاحب کو سکون نہیں ہوا ۔ بے چینی اور اضطراب کا عالم طاری ہے ، دیکھا نماز فجر کے بعد پھر گنگناتے چلے آ رہے ہیں اور پھر ان کی صدا پر یا اطلاع پر ہر طرف سے لوگ لپک لپک کر آ رہے ہیں ۔ بقول مجذوب صاحب کے ؎

آ رہے ہیں ہر طرف سے حالیانِ دردِ دل!

یہ مری آہ و فغاں ہے یا اذانِ دردِ دل؟

یہ تو آٹھ نو گھنٹے کی نشست تھی ، ایک دفعہ لگاتار ۴۸ گھنٹے کی نشست ہوئی جس میں نماز اور کھانے چائے کے علاوہ کوئی وقفہ نہیں ہوا ۔ اس کے بعد بھی یہی محسوس ہوا کہ نہ سنانے والا تھکا اور نہ داستان مکمل ہوئی ۔

۴۸ گھنٹے کی نشست فرنگی محل کے ایک قدیم متوسل قاضی وحیدالدین صاحب کے یہاں ستر کہ ضلع بارہ بنکی میں ہوئی تھی ، اور سب لوگ لکھنؤ سے لد پھند کر وہاں پہونچے تھے ۔

قاضی صاحب کے ایک قدیم ملازم نے گھر والوں اور مہمانوں کا جو حال دیکھا کہ نہ کھانے کا ہوش نہ سونے کی فکر ، بس ایک "بڈھا" گا رہا ہے اور سب میاں لوگ جھوم رہے ہیں تو اسے عجیب معلوم ہوا ۔ اس نے بڑی حیرت سے کہا "ایک سٹری تو خیر ہے رہتا ہی ،

اس کے ساتھ یہ سب میاں لوگ کاہے رکیوں) سٹری ہو گئے؟"

مجذوب صاحب چاہے ایک گھنٹہ سنائیں یا ۴ گھنٹے سب کچھ زبانی سنایا کرتے' ان کو سارا کلام حفظ تھا' نہ بیاض کا جھگڑا نہ نوٹ بک کی قید، یہ بات پہلے پہل میں نے مجذوب صاحب ہی میں دیکھی اس کے بعد جگر صاحب کو دیکھا کہ وہ جو کچھ سناتے ہیں زبانی سناتے ہیں۔ خواہ کتنی پرانی غزل ہو۔

مجذوب صاحب کبھی ایک دفعہ میں کوئی غزل پوری نہ سنا سکے، ایک غزل سناتے سناتے کوئی اور شعر کسی وجہ سے یاد آگیا وہ سنایا اور اسی غزل پر چل نکلے، بیچ میں یاد آگیا یا کسی نے یاد دلایا کہ فلاں غزل ہو رہی تھی فوراً چونکے اور سابقہ غزل کی طرف پلٹ گئے۔ یہ سب ان سے اضطراراً ہوتا تھا۔

غزل ہو رہی تھی ؎

یہ نالہ کناں کون؟ بآوازِ حزیں ہے
دیکھو کہیں مجذوب غزل خواں تو نہیں ہے؟

اس اثنا میں چائے آگئی، چھوٹے چھوٹے حسین فنجانوں میں، مجذوب صاحب بیقرار ہو گئے۔ غزل چھوڑ چھاڑ گنگنانے لگے۔ اب جو شعر انھوں نے پڑھا وہ دوسری غزل کا مطلع تھا اور بے پناہ مطلع ؎

آگئیں یاد وہ آنکھیں مجھے پیمانوں سے
غم مرا اور بڑھا عیش کے سامانوں سے

پھر اسی غزل پر چل دیے ؎

اجنبیت نہیں دل کو ترے پیکانوں سے ۔۔۔ کچھ وہ گھل مل گئے ایسے مرے ارمانوں سے

یا تو ہم کو بھی اجازت ہو، نہیں بہر کرم　　اس تصور کو بھی روکو ایسے دربانوں سے
شوق سے مٹھیاں بھر بھر کے مجھے مٹی دی　　آج تو لا دیا آپ نے احسانوں سے

کس قدر ہوش ربا ہوتا ہے پُر درد کلام
پوچھئے گفتۂ مجذوبؔ کے دیوانوں سے

ابھی گفتۂ مجذوبؔ کے دیوانے ہوش ربائی کی کارفرمائیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ مجذوبؔ صاحب پہلی غزل کی طرف لوٹ گئے اور ایک نیا مطلع سنایا ؎

اک عمر سے انجمن میں مری جانِ حزیں ہے
یہ بھی ہے کوئی بات کہ "ہاں" ہو نہ "نہیں" ہے

اسی غزل میں انھوں نے کہا تھا ؎

اُف عکس کشِ حسن ہیں کیسی مری آنکھیں
کھُپ جاتا ہو نظروں میں ذرا بھی جو حسیں ہے

درحقیقت مجذوبؔ صاحب حسن کے دیوانے تھے، انسانوں سے لے کر فنجانوں تک جہاں بھی انھیں حسن کا جلوہ نظر آتا وہ آپے سے باہر ہو جاتے۔

ایسی ہی ایک محفل میں مجذوبؔ صاحب کی سحری کے لیے آم لائے گئے، عشاء کے بعد سے تین بجے رات تک وہ مولانا قطب میاں صاحب (مرحوم) کے یہاں سناتے رہے تھے۔ دوسرے دن مجذوبؔ صاحب کو روزہ رکھنا تھا گھر جا کر سحری کرتے، مولانا قطب میاں صاحب نے اپنے یہاں انتظام کر دیا تاکہ تھوڑی دیر اور مجذوبؔ صاحب کا سنانا جاری رہے۔ بمشکل سادی چائے پر مجذوبؔ صاحب رضامند ہوئے۔ تھوڑے سے آم بھی تھے، تر و تازہ، خوش رنگ اور سڈول، بس مجذوبؔ صاحب بےچین

ہو گئے اور جب آم پر چاقو چلا تو انھوں نے منھ پھیر لیا۔

اسی وقت انھوں نے برملا حسن پرستی کے "جرم" کا اقرار کیا۔ کہنے لگے "میری چار پانچ مہینے کی ایک پوتی ہے، گوری گوری خوبصورت، نرم نرم ہاتھ پاؤں، اس کو گود میں لے کر ایک دفعہ عجیب خواہش ہوئی، یعنی اس کے پلپلے بدن کو منھ میں لے کر دانتوں سے خوب چباؤں"۔

انسانی بدن کو دانتوں سے چبانے کا تصور بے حد کریہہ، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ وفورِ رغبت کے اظہار میں "لب و دنداں" کی سرگرمیوں کا کتنا دخل ہوا کرتا ہے۔

مجذوب صاحب نے تو نفسیات، عشقیات، اشارات، کنایات، کسی کا بھی سہارا لیے بغیر جو بات محسوس کی کہہ دی، مگر اس طرح انھوں نے اپنی پوری شخصیت کو بے نقاب کر دیا۔ ایسی شخصیت کے لیے ایک ہی جامع لفظ ہے یعنی "حسن پرست" وہ بلا کے حسن پرست تھے، مگر غضب کے محتاط، کہتے ہیں ؎

دیدِ جمال کے سوا کچھ مزا مدعا نہیں	حسن پسند پاک ہوں فاسق بےحیا نہیں

حسن والوں سے وہ دور رہنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ مگر حسن کی بےحجابیاں انھیں سچ مچ پریشان رکھتی تھیں، نہ معلوم کتنی بار انھوں نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ ؎

بُرے لپٹے ہیں یہ غارت گرِ دنیا و دیں مجھ کو	نہ رکھیں گے نہ رکھیں گے کہیں کا یہ حسیں مجھ کو

جواں گردن بھی آیا نظر کوئی حسیں مجھ کو	بس اب ہر دم نگہ رکھنا ہے پیوندِ زمیں مجھ کو

یہ بُت کرنے کو ہیں اب اے خدا بے مرد و دیں مجھ کو	اٹھا لے آسماں مجھ کو، نگل جائے زمیں مجھ کو

یا ؎

پڑے اُف نہ کمسن حسینوں سے پالا — وہ معصوم نظریں وہ منھ بھولا بھالا
دُہائی ہے دردِ محبت! دہائی! — ارے مار ڈالا! ارے مار ڈالا!

ایک دوسری غزل میں کہتے ہیں ؎

آتا ہو نظر حسن ہی جاتے ہیں جدھر ہم — کیا پھوڑ لیں اب آنکھیں ہی اے حسنِ نظر ہم
اُف پڑ ہی گئی اک بُتِ کافر پہ نظر آج — رکھتے تھے اسی ڈر سے تو نیچی ہی نظر ہم

ایک صاحب نے پوچھ لیا "یہ کون بُتِ کافر ہے"۔ فوراً ہی مجذوب صاحب نے دوسرا شعر پڑھا ؎

اتنی تو خبر ہے کہ کوئی ہوش رُبا تھا — رکھتے نہیں کچھ اس کے سوا اور خبر ہم

اسی غزل میں ایک شعر ہے ؎

در پردہ کوئی پردہ نشیں دیکھ لیا ہے — اب حور بھی آجائے تو ڈالیں نہ نظر ہم

محترم مولانا عبدالماجد دریابادی تشریف فرما تھے۔ ۳۲ء یا ۳۳ء کی بات ہے مولانا کی غیرت دینی معمولی بھول چوک پر بھی گرفت کیے بغیر نہیں رہ پاتی وہ جن مرحلوں سے گزر کر آئے تھے غالباً اس کا فطری نتیجہ تھا کہ سخت قسم کا تقشف ان کا نگہبان بن جائے، ہم فرنگی محلیوں کا مسلک، یہ کہ سماع، عرس، اور زیارت قبور کے لیے شدِّ رحال وغیرہ بھی ممنوع نہیں۔ غرض مولانا عنایت اللہ صاحب (فرنگی محلی) اور مولانا دریابادی میں کچھ شعر و شاعری کے مضمرات پہ نوک جھونک ہو رہی تھی۔ مجذوب صاحب نے جب کہا "اب حور بھی آجائے تو ڈالیں نہ نظر ہم"۔ مولانا عنایت اللہ صاحب نے تعریف کرتے ہوئے مولانا دریابادی سے کچھ کہا، مولانا عبدالماجد صاحب نے جواب

میں فرمایا۔ "بے شک اس میں اللہ کی ایک بڑی نعمت کا استخفاف تو پایا ہی جاتا ہے"۔ استخفاف کے لفظ نے جو میرے کانوں کے لیے نیا نیا تھا مولانا کا پورا جملہ ذہن نشین کر دیا۔

مجذوب صاحب خود راوی تھے کہ وہ اپنی موٹر پر جا رہے تھے، حسب عادت متوسط رفتار سے خود ہی ڈرائیو کرتے ہوئے، پیچھے سے زور زور سے "پوں پوں" ہوا اور ایک موٹر تیز رفتاری کے ساتھ ان کے داہنے سے نکل گئی۔ تیز رفتار موٹر کی چلانے والی ایک فیشن ایبل خاتون تھیں اور شاید انھوں نے دقیانوسی صورت والے مجذوب کو ڈرائیور سمجھ کر، دیر میں سائڈ دینے پر چلتے چلتے آنکھیں بھی نکالیں، بس مجذوب صاحب اس ادا میں گم ہو گئے اور فرمایا ؎

اس ناز سے اس شان سے اس تیز روی سے
گزروگے تو دنیا ہی سے جائیں گے گزر ہم

وکٹوریہ اسٹریٹ جس پر مجذوب صاحب کا ۲۰-۱۹۳۰ء میں قیام تھا، وہی سڑک ہے جو مزار حضرت مخدوم شاہ مینا کو علاقہ چوک سے ملاتی ہے۔ مزار شریف پر ہر مہینے دھوم دھام کی نوچندی اس وقت بھی ہوتی تھی اور آج بھی ہوتی ہے، نوچندی کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس میں چوک اور سڑک کی "بالا نشینان" کافی تعداد میں شریک ہوا کرتی ہیں ہر جمعرات کو عام طور پر اور نوچندی جمعرات کو خاص کر سر شام ہی یہ "شام اودھ" کی ذریات آب و تاب اور تام جھام کے ساتھ اس سڑک سے مزار شریف کی سمت جاتی نظر آجاتی ہیں۔ مجذوب صاحب نے اسی غزل میں ایک شعر ایسے ہی ایک موقع کے لیے کہا تھا ؎

بن ٹھن کے نہ نکلو کہ لگا دیں گے نظر ہم ! ہم بھی ہیں سر راہ کھڑے آج حسینو

ایسے شوخ اشعار مجذوب صاحب کی چلبلی طبیعت نے بہت سے کہے ہیں، اس غزل کا ایک مطلع ہے ؎

جانے تو ہمیں دیں گے نہ اب تا بہ سحر ہم — شب ہائے جدائی کی نکالیں گے کسر ہم

پیری میں حسینوں سے لڑائیں تو نظر کیا؟ — دزدیدہ مگر ڈال ہی لیتے ہیں نظر ہم

یہ شوخی ان کی رگ رگ میں رچی ہوئی تھی جس کی لگام مجذوب صاحب خود بھی کسے رہتے تھے اور جب منہ زوری زیادہ کرنے لگتی تھی تو خود اپنے مرشد (مولانا تھانوی) کو اس کیفیت کی اطلاع کرتے تھے وہاں سے مناسب ہدایتیں آجاتی تھیں جس پر مجذوب صاحب عمل پیرا ہو جاتے تھے، وہ زمانہ ان کے لیے سخت مصیبت اور کشاکش کا ہوتا تھا، مرشد کی ایک ہدایت کا علم تو دوسروں کو بھی ہو جاتا تھا، یعنی ان کو شعر خوانی کی ممانعت کر دی جاتی تھی، دوسروں کے لیے بھی یہ ممانعت مصیبت سے کم نہ ہوتی، لوگ طرح طرح سے اصرار کرتے تھے اور مجذوب صاحب خاموش رہتے۔ لیکن یہ کہتے جاتے تھے کہ "آپ لوگوں کو کیا علم، یہاں کلیجے پر چھریاں چل رہی ہیں۔"

ایک دفعہ یہی "توبہ" کا زمانہ چل رہا تھا، سب لوگ سنانے کا تقاضہ کر رہے تھے کہ ایک صاحب (غالباً مفتی عبدالقادر صاحب فرنگی محلی) نے موقعہ کا شعر پڑھ دیا۔

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی ؎
کر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

مجذوب صاحب بے قابو ہو گئے، توبہ ٹوٹنے لگی مگر انھوں نے ضبط کیا اور اٹھ کر چل دیے۔ یہ صبح کی بات تھی، شام کو جو آئے تو جھومتے اور رقص کرتے نئی غزل کے ساتھ ؎

زاہدوں پر مے اچھالی جائے گی | جان ان مردوں میں ڈالی جائے گی
شیخ پینے کا ارادہ تو کرے | حوضِ کوثر سے منگالی جائے گی
اور تو کلیں ہی گے خرقے سے کام | اس میں بوتل بھی چھپالی جائے گی

۴۰۔۵۰ اشعار اس غزل کے شام تک ہو گئے تھے اور اس انداز سے انھوں نے سنائے جیسے کہیں سے رسی تڑا کر بھاگے ہوں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجذوبؔ صاحب عام شاعروں کی طرح شعر گوئی میں "ریاض" کرنے کی زحمت میں کبھی نہیں پھنسے، ایک اُبال کی طرح ان کے جذبات اُبلتے اور موزوں قالب اختیار کرتے چلے جاتے تھے، کبھی کبھی جذبات کا دھارا اتنا تیز ہوتا کہ ایک زمین میں ڈیڑھ سو دو سو شعر تک کہہ ڈالتے تھے اور بلا انتخاب سناتے چلے جاتے تھے۔ کم ازکم تین غزلیں تو مجھے یاد ہیں جو ڈیڑھ سو دو سو اشعار کی ہیں، ایک میں ۲۵ مطلع ہیں، دوسری دو غزلوں میں بھی بیس سے اوپر مطلع کہے ہیں۔

۲۵ مطلعوں والی غزل کا پہلا مطلع ؎

اب بھی مجذوبؔ جو محرومِ پذیرائی ہے
کیا جنوں میں ابھی آمیزشِ دانائی ہے؟

اتنا کہنے والا اور اس قدر بدمستی کے ساتھ سنانے والا مجذوبؔ عام محفلوں سے اور خصوصاً ان تقریبوں سے جو اس کے اعزاز میں کی جائیں دور بھاگا کرتا تھا، اپنا اعزاز وہ کسی طرح پسند نہیں کرتے تھے، کہتے تھے ؎

ہم خاک نشینوں کو نہ مسند پہ بٹھاؤ
یہ عشق کی توہین ہو اعزاز نہیں ہے

سرکاری اعزاز کا جو "خان صاحب" کے خطاب کی شکل میں ملا تھا خود انھوں نے مذاق اڑایا ؎

ہوئے خواجہ صاحب سے ہم خان صاحب
بڑھی خاک عزت گھٹی شان صاحب!

ایک خان بہادر دوست کو خطاب ملنے پر لکھ بھیجا ؎

کیا شان دکھلانے ہو تم اے خان بہادر
تم خان بہادر ہو ہم ایمان بہادر

شاباش ہو شاباش ہو اے خان بہادر
دنیا پہ کیا دین کو قربان بہادر

محفلوں سے گریز کی ایک وجہ تو اُن کی بے قید و بند طبیعت تھی، دوسری وجہ ایک واقعہ کے بعد ظاہر ہوئی یعنی دوسروں کے ہاں کھانا کھانا اس احتیاط کے پیش نظر جو اکلِ حلال کے پابندوں کے لیے ضروری ہوا کرتی ہو مجذوب صاحب پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ مجذوب صاحب اودھ کے ایک مسلمان تعلقدار کے یہاں زبردستی پہونچائے گئے۔ جہاں انھوں نے مجبوراً کھانا بھی کھایا۔ رات بھر کی شعر خوانی کے بعد جب وہ واپس ہوئے تو ایک صاحب سے انھوں نے پوچھ لیا کہ تعلقدار صاحب کی آمدنی میں کوئی ناجائز ذریعہ تو شامل نہیں ہو، اطمینان دلایا گیا کہ وہ سود وغیرہ نہیں لیتے ہیں۔ جزئیات تک مجذوب صاحب نے پوچھ ڈالے اور جب یہ معلوم ہوا کہ لگان وغیرہ کی وصولی میں ان تعلقدار صاحب کے یہاں بھی عام زمینداروں اور تعلقداروں کی طرح کاشتکاروں پر ظلم کیا جاتا ہے تو مجذوب صاحب نے سب کی نظروں سے بچ کر گرم پانی کرا کے استفراغ کیا۔ اور جب اطمینان ہو گیا کہ رات کی غذا کا کوئی ذرہ معدے میں باقی نہیں رہا ہے تو ہلکان ہو کر بستر پر پڑ گئے۔ اس ہلکان کا علم دوسروں کو بھی ہوا اور بڑی دیر میں ہلکان کا راز کھُل پایا۔

یہ تو مجذوب صاحب کے لیے معمولی واقعہ تھا، کمال تو یہ کیا انھوں نے کہ پی ڈالے

پاس کرنے کے بعد نوکری ملی ان کو ڈپٹی کلکٹری کی، کچھ دنوں اس عہدے کو جو آج سے پچاس سال قبل بادشاہی کے مترادف تھا انھوں نے گوارا کیا۔ اس کے بعد انھوں نے استعفا داخل کر دیا، کیوں؟ اس لیے کہ اس ملازمت میں قانونِ شریعت کے خلاف دوسرے قوانین کے تحت انھیں فیصلے کرنا پڑتے تھے۔

ان کی خدمات حکومت یو۔ پی نے محکمہ تعلیمات کو منتقل کر دیں یہاں ان کے ابتدائی عہدے کی تنخواہ ڈپٹی کلکٹری کی تنخواہ سے آدھی تھی مگر وہ راضی اور مطمئن تھے۔ آخر میں جب وہ ایک ڈویژن کے انسپکٹر آف اسکولز ہو گئے اور ایک ہزار کے قریب ان کو تنخواہ ملنے لگی تو اکثر سنایا کرتے تھے:

عیش ہر عزت ہو موٹر کار ہے | اور اس دنیا میں کیا درکار ہے؟
اُس جہاں کی نعمتیں بھی ہوں عطا | اے خدا تیری بڑی سرکار ہے!

کلام مجذوب

از شاہ معین الدین احمد ندوی

تقریباً دس بارہ سال ہوئے راقم الحروف کسی ضرورت سے لکھنؤ گیا تھا، ایک دن مخدومی قطب میاں صاحب سے ملنے کے لیے فرنگی محل جانا ہوا، اس وقت ان کے پاس ایک فرشتہ صورت اور مجذوب صفت بزرگ بڑے والہانہ انداز سے زمزمہ سنجی میں مصروف تھے، ان کی وارفتہ مزاجی اور ظاہری وضع و قطع سے نہ جاننے والا ان کی حیثیت اور مرتبہ کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا، میں بھی سمجھا کہ فرنگی محل کے عقیدت مند خواجگان میں سے کوئی صاحب ہوں گے، لیکن دو ہی چار شعر سنے تھے، کہ کلام کی خوبی نے اپنی جانب متوجہ کر لیا، اور یہ تاثر برابر بڑھتا گیا، تا آنکہ ختم مجلس کے وقت دل کلام کی تاثیر سے معمور اور

لہ یہ مضمون جولائی [illegible] کا لکھا ہوا ہے، شاہ صاحب اور مجذوب صاحب کی ملاقات کا زمانہ بیس بائیس سال ہو گیا ہے۔ (مرتب)

زبان اُس کے اعتراف پر مجبور تھی، یہ شاعر حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب ؔ انسپکٹر مدارس خلیفہ مجاز حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ تھے، جس کا تعارف سے پہلے قیاس بھی نہ ہو سکتا تھا۔

لیکن اس مختصر صحبت سے ذوق کو تسکین نہ ہوئی، بلکہ آتش شوق اور بھڑک اُٹھی، اتفاق سے اسی شب کو کسی تقریب کے سلسلہ میں قطب میاں کی جانب سے دعوت تھی، موصوف نے مجھے بھی مدعو کیا، اس دعوت میں خواجہ صاحب اور دوسرے عمائد شہر بھی شریک تھے۔ کھانے سے فراغت کے بعد محلسرا میں خواجہ صاحب کا جام گردش میں آیا اور نو دس بجے سے لے کر صبح صادق تک برابر موصوف کی شعر خوانی کا سلسلہ جاری رہا، گویا

ملا ساقی جو دریا دل بلانوشوں کی بن آئی ‌ ‌ ‌ اُٹھا یا شام سے ساغر تو پیمانہ سحر رکھا

خود خواجہ صاحب کی زبان میں کلام کی تاثیر کا یہ حال تھا،

جان رگ رگ سے کھنچی آتی ہے کانوں کی طرف ‌ ‌ ‌ کس قیامت کی کشش اُف تری آواز میں ہے

سامعین کی پوری رات آنکھوں میں کٹ گئی تھی، لیکن ہر شخص ہمہ تن گوش تھا، اور سب کی زبان حال گویا تھی،

جی اُٹھے مردے تری آواز سے ‌ ‌ ‌ پھر ذرا مطرب اُسی انداز سے

خواجہ صاحب کے جذب و وارفتگی کا یہ حال تھا کہ پڑھتے پڑھتے بیخودی میں

سلہ مولانا عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ (فرنگی محلی) کا وہ مکان جو ہندوستان کی عظیم علمی اور سیاسی شخصیتوں کی قیام گاہ رہا ہے۔ (مرتب)

اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اور نیم رقص کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی اور اُن کی زبان بول رہی تھی،

یہ نغمۂ دلکش مرا بے ساز نہیں ہے وہ بول رہے ہیں مری آواز نہیں ہے

اس واقعہ کو برسوں گذر گئے مگر وہ سماں اب تک نگاہوں میں ہے، جب تہجد کے سہانے وقت خواجہ صاحب بڑے جوش اور مستی میں یہ مصرع

اندھیرے میں لوٹیں گے جوبن کسی کا

پڑھتے جاتے تھے اور بڑی ترتیل اور خوش الحانی کے ساتھ "[illegible]" کی آیۂ پاک کا مستزاد اس طرح لگاتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ مصرع اسی وقت کے لیے کہا گیا تھا اور اس آیت پاک کی تفسیر ہی ہے۔ اس تفسیر نے اس عامیانہ مصرع کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔

اس وقت سے راقم کو خواجہ صاحب کے کلام کے ساتھ ایک خاص شغف اور ذوق پیدا ہو گیا۔ اس واقعہ کے چند برسوں کے بعد شیوخ دار المصنفین، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے دامنِ فیض سے وابستہ ہو گئے، اس تعلق سے خواجہ صاحب کئی مرتبہ دار المصنفین تشریف لائے، اور یہ دولت گھر بیٹھے مل گئی، لیکن ع:

خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود

افسوس کہ یہ دولت بہت جلد چھن گئی اور دار المصنفین کی آخری آمد کے چند ہی مہینوں کے بعد اگست [illegible] میں یہ مجذوب حق، واصل بحق ہو گیا۔

آج کل سب سے ارزاں جنس شاعری کا ہے، گلی گلی، کوچہ کوچہ میں شاعری کا بازار گرم ہے، لیکن حقیقی شاعری اب بھی نادر و نایاب ہے، عام شعراء کا ذکر نہیں، ان شعراء

ہیں، جن کا شمار شاہیر میں ہے، کتنے واقعی شاعر کہلانے کے مستحق ہیں، پھر ان تلامیذ الرحمٰن کا کیا ذکر ہے، جن کی شاعری ان من الشعر لحکمۃ و ان من البیان لسحرا کے مصداق ہوئے۔

کسی زمانے میں بھی شعرار کی کمی نہیں رہی، ہر دور میں بڑے بڑے اساتذہ پیدا ہوتے رہے، لیکن جن کے کلام میں طور کی تجلی اور وادی ایمن کے شرارے ہوں وہ ہمیشہ نادر و نایاب کے حکم میں رہے۔

فارسی شاعری کے دفتر بے پایاں میں جس سے عارفانہ شاعری پیدا ہوئی، حضرت عطار سنائی، شمس تبریز، مولانا روم، ابو سعید ابو الخیر، اوحدی کرمانی، عراقی، خسرو یا اور اس قبیل کے دو چار شعرار اس حریم قدس کے محرم تھے، جن کے کلام میں آتش عشق کے شرارے اور شراب محبت کی مستی ہے، اردو میں اصحاب دل شعرار کی تعداد اور بھی کم اور انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔

درحقیقت یہ صوت سرمدی موہبتِ الٰہی اور انہی سوختہ سامانوں کا حصہ ہے، جن کے سینے عشق حقیقی کی آگ سے سوزاں اور جن کے دل بادۂ معرفت سے لبریز ہیں، یہ دولت عموماً صوفیائے کرام کا حصہ رہی ہو، خصوصاً خواجگان چشت میں اس شراب کی مستی زیادہ رہی ہے، حضرت مجذوب بھی اسی میکدہ کے بادہ خوار تھے اور ان کی طبیعت کو ذوق و مستی سے زیادہ مناسبت تھی، اس لیے ان پر اس کیفیت کا غلبہ زیادہ تھا، مگر اس سلسلۃ الذہب کے بزرگوں کی طرح اس مستی میں بھی ان کا قدم شریعت و تقویٰ کے جادۂ مستقیم سے کبھی نہیں ہٹا۔

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن

خواجہ صاحب فطری شاعر تھے۔ اُن کے سینے سے شاعری کا چشمہ اُبلتا تھا، کہنے پر آتے تھے تو بے تکان کہتے چلے جاتے تھے، قافیے پناہ مانگ جاتے تھے، لیکن ان کی طبیعت کی روانی نہ رکتی تھی جس پر ان کی طویل غزلیں شاہد ہیں، اس فطرت شعری میں ذوق دہی کی آمیزش نے اس شراب کو اور زیادہ تیز کر دیا تھا، فنی حیثیت سے بھی وہ کامل الفن شاعر تھے، معنوی محاسن سے قطع نظر ان کا کلام ظاہری خوبیوں سے بھی آراستہ اور فنی حیثیت سے اُستادانہ ہے۔ اُن کے کلام میں بڑی نیرنگی اور جامعیت ہے، ایک طرف اس میں سنائیؔ اور عطارؔ کی حکمت، شمس تبریزؔ کی گرمی، مولانا رومؔ کا جوش و خروش، اور خسروؔ کی مستی ہے، دوسری طرف میرؔ کے نشتر اور غالبؔ کے فلسفہ سے لے کر داغؔ اور امیرؔ کی معاملہ بندی، بلکہ ناسخؔ اور امانتؔ کے ضلع جگت تک کے نمونے موجود ہیں۔ جو ان کی قادر الکلامی کی دلیل ہے۔

لیکن یہ ان کا اصل رنگ نہیں، عمومیتِ فیض ہمیشہ سے صوفیائے کرام کا حصہ رہا ہے، اس لیے خواجہ صاحب نے بھی عوام کو محروم رکھنا مناسب نہ سمجھا، اور اُن کی دلچسپی اور تفریحِ طبع کے لیے اپنے کلام میں کچھ رنگین چھینٹے بھی دے دیے ہیں، کہ خواص کے ساتھ عوام بھی ان کے کلام سے لطف اندوز ہو سکیں۔ خود فرماتے ہیں۔

اِدھر ہیں رند مستی میں اُدھر ہیں وجد میں صوفی
مزے ہر رنگ والے کو مرے اشعار میں آئے

اُن کا اصل رنگ جس میں وہ اپنے دور میں بالکل منفرد اور تنہا تھے، عشق حقیقی کی واردات اور راہِ سلوک کے احوال و کوائف کی ترجمانی ہے، ان کے کلام کا یہی حصہ ان کی شاعری کی اصل روح اور خود شاعری کی زبان میں حقائق و معارف کا الہام ہے

یہ معانی یہ حقائق، یہ روانی یہ اثر — شاعری تیری ہوئے مجذوب یا الہام ہے

ان حقائق و معانی و الہام کی کیفیتیں اتنی گوناگوں، نازک اور لطیف ہیں، کہ شرح و بیان کی متحمل نہیں ہوسکتیں اور خواجہ صاحب نے جن جن پیرایوں میں بیان کیا ہو اس کی مثال اردو شاعری میں نہیں مل سکتی، خواجہ حافظ کی طرح اُن کے خیالات کا دائرہ بھی محدود ہے، لیکن بیان کے تنوع اور نیرنگی سے ایک عالم نظر آتا ہے۔

یہی ہو رنگ اگر مجذوبؔ کی مستانہ غزلوں کا — عجب کیا ہند کا وہ حافظ شیراز ہو جائے

بیری عرصہ سے تمنا تھی کہ جس پایہ کا یہ کلام ہو، اسی درجہ کے کوئی بزرگ اس پر قلم اٹھاتے، لیکن جب کہیں سے کوئی صدا نہ اٹھی، تو اپنی نااہلی کے باوجود خود راقم کو اس سعادت کے حصول کا حوصلہ پیدا ہوا، مگر اس کے لیے خواجہ صاحب کے پورے کلام یا کم از کم اس کے معتدبہ حصہ کے مطالعہ کی ضرورت تھی جس کی بظاہر کوئی امید نہ تھی، ایک دو مرتبہ اس کی کوشش بھی کی، لیکن کامیابی نہ ہوئی، اور یہ حسرت دل ہی میں رہ جانے کو تھی کہ طلب صادق کی کارفرمائی نے خود اس کا سامان پیدا کردیا۔

خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعض خواجہ تاش بزرگوں کو اُن کے کلام کی ترتیب و اشاعت کا خیال پیدا ہوا، انھوں نے یہ کام مولانا مسعود علی صاحب ندوی مدظلہ کے متعلق کیا، انھوں نے یہ بار امانت میرے حوالہ کیا، اور راقم کو ایک دیرینہ تمنا پوری کرنے کا موقع ملا۔

خواجہ صاحب کی صورت سرمدی پر مجھ جیسے نااہل اور ناآشنائے ذوق کا قلم اٹھانا بڑی جسارت ہے، لیکن اس حسن نیت کی بنا پر قابل معافی ہے کہ اگر باطنی دولت سے محروم ہے، تو کم از کم اس کے مداحوں ہی کے زمرہ میں شامل ہونے کی سعادت حاصل

ہو جائے۔ شہ

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے، خواجہ صاحب کے کلام کے دو حصے یا دو رخ ہیں ایک خالص مادی شاعری، دوسرا قلبی کیفیات و باطنی واردات، پہلے حصہ پر نقد و تبصرہ آسان ہے، لیکن دوسرے کا تجزیہ بہت مشکل ہے کہ پھول کی بو اور شراب کے نشہ کو الفاظ میں نہیں دکھایا جا سکتا، اور آفتاب کی کرنوں اور نور کی تجلیوں کو مٹھی میں بند نہیں کیا جا سکتا، اس کا ادراک صرف حواس ہی کر سکتے ہیں، تجزیہ سے اس کی ساری لطافت اور خوبی غارت ہو جاتی ہے، اس کا شارح صرف ذوق سلیم ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، راقم ان اسرار کا محرم نہیں، اس لیے کہ اگر کسی شعر کا صحیح مفہوم سمجھنے اور اس کی تشریح میں لغزش ہو جائے تو اس کو راقم کی نارسائی پر محمول کیا جائے، اس اعتراف کے بعد کلام مجذوب کے متعلق کچھ قلبی تاثرات پیش کیے جاتے ہیں۔

بادۂ معرفت دوسرے اکابر اہلِ دل شعراء کی طرح خواجہ صاحب نے بھی باطنی کوائف اور راہِ سلوک و معرفت کے حالات و مقامات کی تعبیر کے لیے بیشتر شراب اور اس کے لوازم کا پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے، گو ان کی تعبیر اسی پیمانہ تک محدود نہیں ہے، بلکہ ان کے خیالات کی طرح ان کے طریقۂ تعبیر میں بھی نیرنگی ہے، لیکن اس سرمست بادۂ وحدت کے واردات کی ابتدا اسی بادہ سے کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، اس سے خواجہ صاحب کے کلام کی اصلی روح کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔

عموماً اس طریقۂ تعبیر میں مجاز کا رنگ اتنا گہرا ہوتا ہے، کہ حقیقت و مجاز میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے، لیکن خواجہ صاحب کے یہاں یہ پردہ اتنا ہلکا اور لطیف

ہے کہ حسن حقیقت کا چہرہ صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے، اور اکثر مقامات پہ خود کلام بول اُٹھتا ہے کہ وہ دوسرے عالم کی آواز ہے۔

حضرت مجذوبؔ کو اپنے مرشد برحق سے والہانہ شیفتگی تھی، اور انھیں فنافی الشیخ کا درجہ حاصل تھا، شیخ کی بارگاہ میں بھی ان کو بڑی مقبولیت و محبوبیت حاصل تھی جس کے اشارے کہیں کہیں ان کے کلام میں بھی پائے جاتے ہیں مثلاً

مجذوبؔ کو تو لائے وہ ہمراہ بزم میں
اور سالکوں کو دور سے رستے بتا دیے

حضرت نظام الدین اولیا، قدس سرہ اور حضرت امیر خسرو کے ربط و تعلق کے جو واقعات سننے اور پڑھنے میں آتے ہیں اس کی زندہ مثال حضرت مجذوبؔ اور اُن کے مرشد کے تعلق میں نظر آتی تھی، حضرت مجذوبؔ شیخ کی شراب عشق میں سراپا مخمور تھے، اور ان کا ہر موئے بدن شیخ کی ثنا و صفت کا ایک شعر تھا، جس پر ان کا کلام شاہد ہے۔

تمہے محبوب کی یا رب شباہت لیکے آیا ہوں	حقیقت اس کو تو کر دے میں صورت لیکے آیا ہوں
جو اشرف تھا زمانہ میں حج اشرف ہو زمانہ میں	میں ایسے تیرے اشرف کی عقیدت لیکے آیا ہوں

اسی لیے ان کے قریب قریب کل اشعار میں ساقی و پیر میخانہ سے مراد شیخ طریقت ہیں، بعض بعض اشعار میں یہ کنایہ تصریح کی حد تک پہونچ جاتا ہے۔

چڑھی ہو کچھ ایسی کہ تیور تو دیکھو	جوان آج پیر مغاں ہو رہا ہو
دمکتا ہو چہرہ چمکتی ہیں آنکھیں	بڑھاپے میں بھی جانِ جاں ہو رہا ہو

حو من کوثر موجزن پیر مغاں کے دل میں ہو کس میں بیہودہ بات جو اس مرشدِ کامل میں ہو؟

ہزار راحت ہزار رحمت مگر نہیں دم زدن کی جرأت
یہ سادگی میں بھی رعب و ہیبت اسی جلالِ کتاب میں ہے

یہیں سے پاؤں گا ہر نعمت دنیا و دیں ساقی کہیں کیوں جاؤں تیرے میکدہ میں کیا نہیں ساقی؟
ٹلوں گا میں ہرگز لاکھ ہو تو خشمگیں ساقی کہ جو سب سے بہتر ہو وہ ملتی ہو یہیں ساقی

شرابیں سیکڑوں ساقی ہزاروں بادہ کش لاکھوں
میں اُن کا مست ہوں آنکھوں سے جو مخمور کرتے ہیں

مجذوب ہی کا خانہ دل کیا ہے کہ آپ نے گھر ایسے ایسے کتنے نہ جانے سجا دیے
اس قسم کے بہ کثرت اشعار ہیں جن سے حضرت مجذوب کے ساقی و میخانہ کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے ، فرماتے ہیں :-

مرے جام و مینا نہیں جام و مینا یہ ہو قلبِ روشن وہ ہو چشمِ بینا

ان کے میخانہ کے شیوخ کا سلسلہ اس رحمۃ للعالمین پر منتہی ہوتا ہے ، جس کے فیض سے سارا عالم سیراب ہے ۔

نہ چھیڑ اے محتسب ، میں ہوں مئے وحدت کا متوالا
میں وہ میخوار ہوں جس کے ہیں ختم المرسلین ساقی

کہوں کیونکر نہ تجھ کو رحمۃ للعالمیں ساقی
کہ تیرے فیض سے سیراب ہو روئے زمیں ساقی

اس شراب کی حقیقت ظاہر ہونے کے بعد اب اس کے اثرات اور مختلف کوائف ملاحظہ ہوں، اس کے بادہ خواروں کے دل خوف و خشیت سے لبریز ہوتے ہیں،

بہت پاتا ہوں میں رندوں میں خوفِ یومِ دیں ساقی
بنی اُمُّ الخبائث بھی شرابِ الصالحیں ساقی

ان پر سارے اسرار دین فاش ہوتے ہیں اور انھیں ایمان کامل کا درجہ حاصل ہوتا ہے ؎

ترے رندوں پہ سارے کھل گئے اسرارِ دیں ساقی
ہوا علم الیقیں، عین الیقیں حق الیقیں ساقی

اس وقت یہ کہنا بالکل صحیح ہے۔

کہاں سے مجھ کو پہونچایا کہاں پیرِ مغاں تو نے
مرا میخانہ اب لاہوت ہو روح الامیں ساقی

یہ میخانہ انوار الٰہی کا منبع اور عرش بریں کا ہم پایہ ہے،

تری محفل میں کیا انوار ہیں اے مہ جبیں ساقی
اُتر آیا زمیں پر آج کیا عرشِ بریں ساقی

اس میخانہ کی دریوزہ گری کے بغیر کمال حاصل نہیں ہو سکتا ؎

عبادت ریاضت کرے لاکھ زاہد　　مقدس جو ہوگا تو مے خوار ہو کر

جو پھر کبھی تجھے زاہد طلب ہو کوثر کی کچھ اور بھی ہو ذرا چکھ تو میرے ساغر کی

اس راہ کی ابتدائی جھجک کی کتنی لطیف اور صحیح توجیہ ہے:۔

پہلا موقع ہو نہیں پڑتی ہو ہمت کیا کریں جام لیتے ہاتھ کپتا ہو تو اے ساقی نہ ہنس

اس شعر پر راقم کو ایک ذاتی مشاہدہ یاد آگیا ۔ میرے ایک محترم بزرگ نے جب ابتدا میں اس راہ میں قدم رکھا تو عادت نہ ہونے کی وجہ سے ان کو "جام" یعنی تسبیح ہاتھ میں لینے میں جھجک محسوس ہوتی تھی اور فرماتے تھے کہ اس پر ریا کا دھوکا ہوتا ہو لیکن رفتہ رفتہ جب اس کا چسکا لگ گیا تو اب جام و ساغر کسی وقت بھی ان کے ہاتھ سے جدا نہیں ہوتا ۔ بقول مجذوبؔ ۔

پہلے عادت پھر عبادت ہوگئی وہ ریا جس پر تھے زاہد طعنہ زن

اور اب ان کا یہ حال ہو ۔۔

میرا دور زندگی ہے یہ جو دور جام ہے دم رکا سمجھو اگر دم بھر بھی یہ ساغر رکا

جام و ساغر و مینا کی یہ تشریح خود حضرت مجذوبؔ کی زبان فیض ترجمان سے راقم نے سنی ہے ، فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ الٰہ آباد کی انسپکٹری کے زمانہ میں کاموں کی اتنی کثرت ہوگئی تھی ، کہ اوراد و وظائف کے معمولات پورا کرنے کا بھی موقع نہ ملتا تھا ، اس کی ترجمانی اس شعر میں فرمائی تھی :۔

ارے یہ بھی ہے کوئی جینے میں جینا نہ مطرب نہ ساقی نہ ساغر نہ مینا

اسی طریقہ سے اس شعر :۔

کہ بدل تو بغل میں ہاتھ میں پیمانہ ہوتا ہے روانہ سوئے کعبہ یوں ترا مستانہ ہوتا ہے

کی تشریح میں فرمایا کہ ہاتھ میں تسبیح اور بغل میں کلام مجید ،

یہ واقعات درمیان میں ضمناً آگئے، اصل مقصود بادۂ معرفت کے احوال و کوائف پیش کرنا تھے۔ ابتدائی جھجک کا منظر اوپر گذر چکا ہے۔ آخر میں غلبۂ شوق کا یہ حال ہو جاتا ہے،

پینے سے کیا بجھے گی بلا کی ہے تشنگی ساقی تو آج مجھ کو ڈبو دے شراب میں

لیکن یہ شراب بڑی تیز و تند ہے اس کا تحمل آسان نہیں۔

یہ کس بھٹی کی دی تو نے شراب آتشیں ساقی کہ آنکھوں سے لہو کی ندیاں بہنے لگیں ساقی

پلادی یہ کس تیز بھٹی کی ساقی کہ مجذوب آتش بجاں ہو رہا ہے

دے تاؤ نہ اب اتنا کہ آنچ ذرا دھیمی نہ دوروں پہ ہو مے ساقی اڑ جائے نہ میخانہ

اس میخانہ کے بادہ خوار ہی ان کوائف کا اندازہ کر سکتے ہیں، ایسی تیز و تند شراب کے لیے بڑے اندازہ داں ساقی کی ضرورت ہے۔

نظر میں جانچ لیا ہے کہ کس کا ظرف کتنا ہے دکھائے کوئی ایسا نکتہ رس اندازہ داں ساقی

ہے ہشیار پی کر خم کے خم بھی تیرے متوالے ترے اندازے بخشی پہ ہے صد آفریں ساقی

اس شراب کے انقلاب انگیز اثرات:۔

ساقی نے بدل ڈالی دنیا مری ہستی کی آنکھیں ہیں کہ میخانہ دل ہے کہ پری خانہ

اس شعر کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے اس حالت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، کہ صاحبِ دل بزرگوں کی آنکھوں میں ایک خاص کیفیت و کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ان کا دل یادِ الٰہی سے معمور رہتا ہے۔

شیخ و زاہد محتسب وغیرہ | مے پرستوں یعنی بادۂ معرفت کے متوالوں اور شیخ و زاہد محتسب یعنی متقشف علمائے ظاہر میں پرانی رقابت ہو اور ان پر طعن و طنز شاعری کا جزو بن گیا ہے، خواجہ حافظ اس فن کے امام ہیں، انھوں نے ریاکار زاہدوں کی خوب پردہ دری کی ہو، لیکن ان بزرگوں کے کلام میں جہاں شیخ و زاہد وغیرہ کا ذکر آیا ہو، اُن سے مراد وہ ریاکار ارباب ظاہر ہیں، جن کے دل شراب معرفت یعنی دین کی روح سے خالی ہیں۔ اور ان کا کام صرف دوسروں کی عیب چینی ہو، ورنہ وہ علمائے برحق جو شریعت و طریقت کے مجمع البحرین اور دین کی پاسبانی کے ساتھ اس حریم قدس کے بھی محرم ہیں، ہر طبقہ کے لیے واجب الاحترام ہیں، رندانہ شاعری میں ان سے نہیں، بلکہ پہلے طبقہ کے علماء سے خطاب ہو، خواجہ صاحب میں طبعی شوخی اور زندہ دلی تھی اسلئے انھوں نے بھی اُن پر بڑی لطیف چوٹیں کی ہیں، لیکن وہ محض تمسخر اور استہزا نہیں ہیں، بلکہ اس میں بڑے نکتے اور لطائف پیدا کیے ہیں۔

محض ارباب ظاہر سے فیض باطنی کا حصول ممکن نہیں۔

ترا وجو ہے بے فیض مردہ دل زاہد! | کہ نخلِ خشک سے امیدِ برگ و بار نہیں

اس بے جان جسم میں محبت کی گرمی سے روح پیدا ہو سکتی ہو۔

زاہدوں پر مے اچھالی جائے گی | جان ان مردوں میں ڈالی جائے گی

راہِ سلوک و معرفت کے شرائط محض احکام شرعی کی پابندی سے زیادہ سخت ہیں۔

زاہد درِ میخانہ بھی کیا ہے درِ توبہ | یہ ہر کس و ناکس کے لیے باز نہیں ہو۔

اس لیے عالم ہونا آسان ہو اور عارف ہونا بہت مشکل ہے۔

ترکِ دنیا اور گوشہ گیری میں دینداری کا کمال نہیں، بلکہ دنیا میں رہ کر دین پر

قائم رہنا اصل کمال ہے۔

دکھا اتقا کے رندوں میں زاہد — یہ حجرے میں کیا پارسا ہو رہا ہے

ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صرف اہلِ دل کا معیارِ تقویٰ سند ہے۔

یہ واقعات نادر نہیں کہ اہلِ دل کی ایک نگاہ نے بڑے بڑے علما کی کایا پلٹ دی ہے۔

ذرا ہشیار رہنا شیخ جی میں ہوں وہ مستانہ — نظر میں زاہدِ صد سالہ کو پیرِ مغاں کر دوں

بعض شوخ مذاق

شیخ کی پگڑی اچھالی جائے گی — سرکشی سر سے نکالی جائے گی
رخصتِ توبہ کے دن ہمراہ شیخ — دخترِ رز بن کے سالی جائے گی

راہِ عشق و محبت کے کوائف اور سلوک کے احوال و مقامات

جذبات کی دنیا میں عشق و محبت کی کیفیتوں سے زیادہ لطیف پر کیف وسیع اور گوناگوں کوئی جذبہ نہیں، یہ اپنے اندر کیفیات کا ایک عالم رکھتا ہے۔ بحرِ محبت کی موجیں بڑی پُرجوش اور ان گنت ہیں، شعرا کے تخیل نے بڑی بلند پروازیاں کیں، بڑی گہرائیوں میں ڈوبے۔ مگر کوئی شاعر اس کا احاطہ نہ کر سکا۔

یہ تو مادی عشق و محبت کے جذبات کی نیرنگی کا حال ہے، جو نسبتاً محدود ہیں۔ پھر عشقِ حقیقی کے بحرِ ناپیدا کنار کی وسعت و گہرائی اور جوش و خروش کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ جس کی بقول مجذوب کوئی ابتدا و انتہا نہیں۔

کشتیِ دل یہ کہاں آ گئی ناخدا کہاں — ہٹیے تو ابتدا نہیں بڑھیے تو انتہا نہیں

اور بڑے بڑے اصحابِ دل شعرا کو اپنے عجز و نارسائی کو اعتراف کرنا پڑا۔

دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر | ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

یہ عالم لاہوت بے کیف و کم ہونے کے باوجود گوناگوں کوائف سے معمور ہے۔ حضرت مجذوبؔ نے ان کی بڑی لطیف ترجمانی کی ہے۔ یہ ان کی شاعری کا بڑا نازک اور دقیق حصہ ہے۔ جس سے صرف ذوق سلیم ہی لذت گیر ہو سکتا ہے۔

یہ راہ سراسر عشق و محبت کی ہے، اور محبت کے حالات و کوائف گوناگوں ہیں، اس کا مقام عرش سے بھی اونچا ہے۔

سنبھل کر ذرا تیز گام محبت | مقام ادب ہے مقام محبت
مقام فنا ہے مقام محبت | کہ یکساں ہو سب خاص و عام محبت
چڑھیں دار پر یا چڑھیں طور پر ہم | رسائی سے بالا ہے بام محبت
ازل ابتدا ہے ابد انتہا ہے | نہ صبح محبت نہ شام محبت
نہ ہوگا ابد تک بھی پورا نہ ہوگا | مرا قصۂ ناتمام محبت
ٹھہر یادِ جاناں ٹھہر میرے دل میں | یہی ہو یہی ہو مقام محبت

لیکن یہ راہ بڑی کٹھن اور دشوار گذار ہے، اس میں کامیابی کی پہلی شرط ہمت و استقلال اور مصائب و مشکلات کا مقابلہ ہے۔

دیکھ یہ راہ عشق ہے، ہوتی ہے بس یوں ہی یہ طے
سینہ پہ تیر کھائے جا، آگے قدم بڑھائے جا

بس چلا چل قطع راہ عشق اگر منظور ہے | یہ نہ دیکھ اے ہمسفر نزدیک ہے یا دور ہے

ہمیں تو رات دن اے ہمسفر چلنے سے مطلب ہے | سفر محدود ہو جس کا اسے ہو فکر منزل کی

اس راہ کی لغزش بھی وصول کا ذریعہ ہے۔

میں لاکھ چلا پھر بھی پہونچا نہ سرِ منزل	کچھ تو ہی سہارا دے اے لغزشِ مستانہ

اور اس کی گم کردہ راہی کا بھی یہ درجہ ہے :-

طریقِ عشق میں جو جس قدر گم کردہ منزل تھا
وہ بس اتنا ہی اے دل خضرِ رہ بننے کے قابل تھا

یہ دولت کیا کم ہے :-

اک مسلسل کیفیت ذوق و شوق میرے دل میں ہو
خیر یہ مقصد تو حاصل سعیِ لاحاصل میں ہے،

اس راہ میں جان تک کی بازی لگانے میں دریغ نہ کرنا چاہیے :-

بے جھجک شوق سے ہاں مرنے پہ ہو جا تیار	بے نشاں ہو کے وہ کچھ اپنا پتہ بھی دیگا
دیتا ہو زہر کا پیالہ مرا ساقی پہلے	پی لیا جس نے اُسے آبِ بقا بھی دیگا

خرد ہوش سب کچھ گنواتا چلا جا	نشاناتِ ہستی مٹاتا چلا جا
جو سب کچھ ہو برباد مطلق نہ غم کر	بس اک خیر دل کی مناتا چلا جا

اس راہ کی دوسری شرط جنون و سودا ہے، بغیر مجنونانہ طلب کے مقصود حاصل نہیں ہو سکتا، اور بغیر خود کو کھوئے ہوئے مطلوب نہیں مل سکتا۔

میں ہوں اور حشر تک اس در کی جبیں سائی ہو	سر زاہد نہیں یہ سر سر سودائی ہے
اب بھی مجذوب جو محرومِ پذیرائی ہے	کیا جنوں میں ابھی آمیزشِ دانائی ہے؟

بقدرِ جنوں مجذوب واصل ہوتا جاتا ہے — کہ ہوش اپنا تو زائل ان کا حاصل ہوتا جاتا ہے
ادھر ہر گام پر گم کردہ منزل ہوتا جاتا ہے — بفیضِ جذب ادھر مجذوب واصل ہوتا جاتا ہے

حدیث کی کتابوں میں صحابہ کرامؓ کے حالات میں آتا ہے، کہ اگر تم ان کی شدتِ ایمان اور جوشِ عمل کو دیکھتے تو ان کو مجنون سمجھتے۔ (او کما قال)

کوئی طالب محروم نہیں، قرب و دوری وغیرہ اس راہ کے مختلف کوائف ہیں۔

سر دار ہو کر، سر طور ہو کر — ترے پاس پہونچے بہت دور ہو کر
عدیں عشق کی کر رہے ہیں وہ قائم — کبھی پاس آ کر، کبھی دور ہو کر

زیادہ قرب خطرناک ہے، اس میں طالب کو اپنی ذات پر مطلوب کا دھوکا ہو جاتا ہے۔

نہ پاس آؤ اتنا، نہ لو دور ہو کر — میں کچھ اور کہدوں نہ منصور ہو کر

مطلوب کی ظاہری بے توجہی بھی در پردہ توجہ ہے، اور کسی نہ کسی عنوان طالب کی تشفی کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔

مجھے یاس کیوں ہو کہ وہ دل میں بیٹھے — برابر تسلی دیے جا رہے ہیں

اُن سا کوئی ہمدم کوئی دم ساز نہیں ہے — ہر وقت ہیں باتیں مگر آواز نہیں ہے

اس کا غضب بھی دراصل کرم ہے، صرف پردہ عتاب کا ہے، کہ یہ بھی اصلاح و تطہیر کا طریقہ ہے۔

جلوۂ محبوب کے لیے قلب کا ماسوا سے فارغ ہونا ضروری ہے، کہ ایک مکان میں

دو مکین نہیں رہ سکتے۔

آ میرے دل کی بزم تمنا میں اب تو آ — دیتے تھے جو دھواں وہ دیے سب بجھا دیے

وارفتگیٔ شوق کا امکاں نہیں رہا — آجا کہ دل میں اب کوئی ارماں نہیں رہا

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی — اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

مجذوب اور سالک کا فرق

اگرچہ مجذوب اور سالک ہیں دونوں ہی ایک راستہ پر

بڑا تفاوت ہے منزلوں میں یقیں یقیں ہے گماں گماں ہے

ایک دوسرے شعر میں اس بلند تر تخیل کو اس سے زیادہ بلیغ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔

بیخودِ شوق یہاں جلوہ گہِ ناز میں ہے — طور پر بحث ابھی صورتِ آواز میں ہے

اقبال نے بھی تقریباً اسی مفہوم کو اس شعر میں ادا کیا ہے۔

بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم — دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

حقیقت یہ ہے کہ عشق کی وارفتگی کا درجہ علم و یقین کے تدبر اور احتیاط سے بمراحل بلند ہے۔ بلکہ بقول اقبال ؏

عشق تمام مصطفےٰ عقل تمام بولہب

عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب اور علم مقامِ صفات عشق تماشائے ذات

اس تشریح کے بعد اب اس شعر کو پھر پڑھئے۔

بیخودِ شوق یہاں جلوہ گہ ناز میں ہو طور پر بحث ابھی صورت آواز میں ہو

اس سے معراج نبوی بھی مراد لی جا سکتی ہے۔

سوز محبت اور گداز عشق کی کیفیتیں

دل کا سوز جراحت عشق و محبت کی روح ہو، اس کے بغیر عشق میں جان نہیں پیدا ہوتی۔ ع:-

برق گرتی ہو تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

اس سے مراد فریاد و فغاں اور نالہ و شیون نہیں ہو، بلکہ سوز و ساز اور درد و لذت و الم کی وہ لطیف کیفیت مقصود ہے جس سے روح لذت گیر ہوتی ہو، عشق حقیقی میں یہ کیفیتیں اور زیادہ تیز اور شدید ہوتی ہیں، روایتوں میں ہو کہ حضرت امیر خسروؒ کا دل سوز عشق سے اتنا بریاں تھا کہ حضرت نظام الدینؒ اس پر فخر کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ جب خدا قیامت میں مجھ سے پوچھے گا، کہ میرے لیے کیا تحفہ لایا ہے، تو عرض کروں گا اس ترک بچہ کا سوز سینہ لایا ہوں۔

اس عالم میں دل پر سوز و ساز، درد و الم، کیف و سرور، حسرت و یاس، امید اور ناامیدی کی مختلف کیفیتیں طاری ہوتی ہیں، مجذوب کے کلام میں جابجا یہ کوائف نظر آتے ہیں۔

درد و الم کی مختلف کیفیتیں:-

عالم عشق و محبت میں بہار آئی ہو آنسوؤں کی ہو جھڑی غم کی گھٹا چھائی ہو

اس دل زار سے منفر عشق میں جیتے جی نہیں رونا ہو مجھ کو عمر بھر غم مرا عارضی نہیں

کسی حال میں چین پاتا نہیں دل — نہ مغموم ہو کر نہ مسرور ہو کر

جہاں سانس لینے میں ہو آہ پیدا — اب ایسی کوئی میں فضا چاہتا ہوں

مری چشم پرنم مرا قلب پُرغم — یہ مینائے الفت وہ جامِ محبت

پھونک دی اک روح تو مجھ میں مری ہر آہ نے
دردِ دل نے میری اک رگ رگ کو رگِ جاں کر دیا

روح مثلِ شعلۂ جوالا رقصاں ہے مری
کس مزے کی ہائے سوزش داغہائے دل میں ہے

یہ تلخ ہو گو غمِ نہانی مگر ہو لبریزِ شادمانی
سرور کی جیسے ہو نشانی وہ اک جو تلخی شراب میں ہو

یاس بھی اب دل کی فطرت ہو گئی — آرزو جو کی وہ حسرت ہو گئی
جی رہا ہوں موت کی اُمید میں — مر ہی جاؤں گا جو صحت ہو گئی

میں ہی محروم ہوں اک خلق تماشائی ہو — کیا غضب ہے یہ اے ذوقِ جبیں سائی ہو

زباں بے دل ہو اور دل بے زباں ہو ہائے مجبوری
بیاں میں کس طرح آئے کہ جو دل پر گذرتی ہے

دنیائے عشق و محبت کے آئین و قوانین جدا ہیں، کہنے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے۔ ع

عاشقاں را مذہب و ملّت جدا

اس لیے عشاق کی عبادت بھی عوام سے مختلف ہو۔ اس میں ظاہری شرائط کی پابندی کے ساتھ عبادت کی اصل روح ضروری ہے۔ اس کے بغیر عبادت نہیں ہوتی، حدیثوں سے بھی ثابت ہے کہ اخلاص و حضور قلب کے بغیر عبادت ناقص ہوتی ہے۔

پھر زاہدوں کی عبادت صرف نماز تک محدود ہوتی ہے، لیکن اہل دل کی عبادت یعنی ذکر و فکر ہر وقت جاری رہتی ہو جس کے لیے کسی سمت و آستانہ کی بھی ضرورت نہیں ہو بلکہ صرف معبود و مسجود کا تصور کافی ہے، اسی کو حضرت مجذوب نے سجدۂ بے جبین سے تعبیر کیا ہے۔

تم کو نصیب زاہدا سجدۂ بے جبیں نہیں پیش نظر ہے آستاں مدّ نظر مکیں نہیں

اس کی بنیاد اسی آیت پر ہے۔ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ

سجدہ درحقیقت وہی ہے کہ ایک مرتبہ سر جھک جانے کے بعد پھر نہ اُٹھے۔

جھک کے اٹھے نہ پھر کبھی لائق سجدہ ہو جبھی نیز سر سجود ابھی مدخور آستاں نہیں

نغمہ وساز | بزرگانِ چشت کو سماع سے خاص مناسبت تھی، بلکہ بعضوں پر اس کا غلبہ رہا ہے کہ ان کونے سے بھی نے نماز ہی کی آواز سنائی دیتی تھی۔

خشک تار و خشک چوب و خشک پوست   از کجامی آید ایں آواز دوست

حضرت خواجہ صاحب گو اس شراب سے محترز رہے، لیکن وہ سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے اس باطنی اثر کو نہ مٹا سکے، بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ وہ خود سراپا ساز نغمہ تھے۔

جنھیں ان کی زمزمہ سنجی سے سامعہ نوازی کا موقع ملا ہے وہ اسکی تصدیق کر سکتے ہیں کہ خواجہ صاحب ہمہ تن جوش و مستی تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کی آواز میں بھی لحنِ داؤدی کا اثر عطا فرمایا تھا، جب وہ جوش و مستی میں مترنم ہوتے تھے تو اُن کا ہر موئے بدن ساز بن جاتا تھا۔

خود فرماتے تھے :۔

یوں تو اس پیکرِ ہستی میں مرے کچھ بھی نہیں   کوئی مطرب ہو تو ہر نغمہ مرے ساز میں ہے

مرا ساز ہستی ہے لبریز نغمہ   کوئی مطرب خوش نوا چاہتا ہوں

اس پر بھی ان کا اصل نغمہ ناشنیدہ ہی رہا۔

کوئی محرم نہیں سب حال مرا راز میں ہے
ناشنیدہ ہے وہ نغمہ جو مرے ساز میں ہے

یہ نغمہ وہی تھا جس کا اس شعر میں اشارہ ہے۔

سر پنہاں ست و اندر زیر و بم   فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

تغزل | یہاں تک خواجہ صاحب کے کلام کی معنوی اور باطنی حیثیت پر گفتگو تھی جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے، فن کی حیثیت سے بھی ان کا کلام استادانہ ہو اس میں بڑی جامعیت اور ہر رنگ کے نمونے موجود ہیں، ان کو دکھائے بغیر تبصرہ ناقص رہ جائے گا۔ اس لیے ان کے کلام کے بعض ظاہری نمایاں رُخ پیش کیے جاتے ہیں۔ خواجہ صاحب فطرتاً شاعر، لطیف الاحساس، خوش خیال، خوش نگاہ، جمال پسند اور رنگین مزاج تھے، اس کا پرتو ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہے، اور اس میں دنیاوی عشق و محبت کے نہایت رنگین اور دلفریب مرقعے ہیں۔ خود فرماتے ہیں:۔

حسن کا خوشنما چمن عشق کا دل کشا چمن

سر سے ہے تا بہ پا چمن یہ مری شاعری نہیں

اس میں لطیف، ہلکے اور شوخ اور گہرے ہر رنگ کے خوشنما پھول ہیں۔

کہیں کہیں بیان کی شوخی اور رنگینی اتنی تیز ہو گئی ہے کہ اس کے سامنے داغ اور امیر کا رنگ پھیکا نظر آتا ہے، اور یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ایک ساز سے ایسے متضاد نغمے بھی نکل سکتے ہیں، مگر اس موج کوثر کی طہارت اور پاکیزگی کو مادی کثافت سے مکدّر کرنا ذوق سلیم گوارا نہیں کرتا، اس لیے صرف لطیف اور پاکیزہ تغزل کے نمونے پیش کیے جائیں گے، ان میں سے اکثر اشعار میں نہایت نمایاں اور کھلا ہوا تغزل ہے، اور بعض میں حقیقت اور مجاز کی سرحدیں اتنی ملی ہوئی ہیں، کہ دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہے۔ اس کے لیے میں نے اپنے ذوق کو رہنما بنایا ہے۔

محبت کا ایک رُخ اوپر پیش کیا جا چکا ہے، اب اس عالم آب و گل کی کچھ کیفیتیں

ملاحظہ ہوں ؎

مرے سامنے لو نہ نامِ محبت — چھلک جائے گا ہائے جامِ محبت
تری چشمِ مے گوں ہے جامِ محبت — تری زلفِ مشکیں ہے دامِ محبت
پلادے پلادے پلادے پلادے — پلا دے ان آنکھوں سے جامِ محبت
محبت محبت محبت محبت — بڑا لطف دیتا ہے نامِ محبت
محبت کے بدلے محبت ستم ہو — نہ لے اُف نہ لے انتقامِ محبت
نہ رُک ہائے قاصد نہ رُک ہائے قاصد — کہے جا، کہے جا پیامِ محبت

یہ کھیل دل کے لینے کے جو کھیلتے ہیں آپ — مجھ سے نہ کھیلئے کسی ناداں سے کھیلئے
جو چاہے کھیل کھیلئے دنیا ہے آپ کی — ہولی مگر نہ خونِ دل و جاں سے کھیلئے
اے جلوہ ہائے دوست بس اب کیجئے کرم — اتنا نہ میرے دیدۂ حیراں سے کھیلئے

حسن خود حسن ہوا تیرے حسیں ہونے سے — روئے زیبا ترا خود زینتِ زیبائی ہے

تجھے زیب و زینت کی حاجت ہی کیا ہو — نظر میں سما کر سنور جانے والے

تنِ یاسمیں پر لباسِ مصفیٰ — وہ آئے ہیں نورٌ علیٰ نور ہو کر
وہ نظروں میں میری کھُبے جا رہے ہیں — سراپا ادا چشمِ بد دور ہو کر

یہ ناز یہ انداز یہ شوخی یہ ادائیں　　اے زلف بدوش آ تری لیلوں میں بلائیں

تبا رنگین تن رنگیں دہن رنگیں، نظر رنگیں　　تمھیں دیکھا کہ اس جا مجتمع رنگینیاں دیکھیں

نہا کر تو نہ جانے حسن کا عالم ہی کیا ہوگا　　پسینہ پونچھنے سے جب تری رنگت نکھرتی ہو

صراحی در بغل ساغر بکف مستانہ وار آ جا　　لگائے آسرا بیٹھا ہو اک مستانہ برسوں سے

آ رہا ہو جھومتا وہ مست ناز　　اب طبیعت کیا سنبھالی جائے گی

ان اشعار پر کسی فارسی استاد کے دو شعر یاد آگئے۔

پریشاں کاکل و آغوش وا مستانہ می آئی　　سرت گردم بایں شانیکہ از میخانہ می آئی

باصد کرشمہ آں بُتِ بدست میرود　　خود می کند خرام و خود از دست میرود

ایک بہترین شعر

نہیں درکار ہے ہم کو پئے جا تو ہی اے ساقی
ہمیں تو مست کرتا ہے ترا سرشار ہو جانا

بوضع رندانہ گھومتے ہیں، قدم حسیں بڑھ کے چومتے ہیں
بشانِ مستانہ جھومتے ہیں وہ کیفِ مستی شباب میں ہے

یہ کون آیا کہ دھیمی پڑ گئی لَو شمع محفل کی ‏ پتنگوں کی جگہ اڑنے لگیں چنگاریاں دل کی

اہلِ محفل فرشِ محفل ہو گئے ‏ بزم میں آئے وہ اس انداز سے

اللہ اللہ ترے آتے ہی آنکھوں کا ہجوم ‏ حسرتِ دید بھی مشکل سے نکل پائی ہے

خود کو بھی ترے عشق میں ہم غیر ہی سمجھے ‏ جی بھر کے نہ دیکھا کہ لگا دیں گے نظر ہم
کس آنکھ سے دیکھیں انھیں ہمت نہیں پڑتی ‏ وہ مصحفِ رُخ پاک ہے آلودہ نظر ہم

کروں ناصح میں کیونکر ہائے یہ عذر نہ دیکھوں گا ‏ نظر پڑ جائے گی خود ہی جو دانستہ نہ دیکھوں گا

اُن کی نظرِ شوخ ہو اک طرفہ تماشا ‏ ہر شخص سمجھتا ہو ادھر دیکھ رہے ہیں

یوں نظر تو مجھ پہ ڈالی جائے گی ‏ جب میں دیکھوں گا ہٹالی جائے گی

ادا یہ دیکھ کے عاشق کو جھینپ جانے کی ‏ حضورِ یار کھلتی ہو رسوائیاں زمانے کی

دل میں گُل عشق نے داغوں کے کھلائے تو بہت
ان کی گلگشت کے قابل یہ گلستاں نہ ہوا

غزل ہو مری اور وہ گا رہے ہیں　　غضب کر رہے ہیں ستم ڈھا رہے ہیں

گنگناؤ گے جو اس انداز سے　　خود تڑپ نکلیں گے نغمے ساز سے

اب صبح ہوئی اب وہ اٹھے اب وہ سدھارے　　آثارِ سحر دیکھتے ہیں قبلِ سحر ہم

نہ شیخ آرہی ہے نہ وہ آرہے ہیں　　نہ موت آرہی ہو نہ خواب آرہا ہے
وہ میخانہ بر دوش چرخ بریں پر　　لبعد کیف مستی سحاب آرہا ہے

وہ بیٹھے رہتے ہیں دیکھوں تو بُت بنے کب تک　　جو بیقرار نہ کردوں تو بیقرار نہیں

سلاست وصفائی حضرت مجذوب زبان وادب کا بھی بہت ستھرا مذاق رکھتے تھے ان کا پورا کلام زبان کی صفائی، سادگی اور سلاست کا نمونہ ہے۔ ان کے بہت کم اشعار اس وصف سے خالی نکلیں گے، خصوصاً چھوٹی بحروں کی غزلیں جن کے بہت سے اشعار اوپر نقل ہو چکے ہیں۔ سادگی اور سلاست کے لحاظ سے سہل ممتنع کے حکم میں ہیں طویل بحروں میں بھی بہت سے متفرق اشعار ایسے ڈھلے ہوئے اور برجستہ نکل گئے ہیں، کہ ضرب المثل بننے کے لائق ہیں۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ارے اس طرف اک نظر بھی خدارا　　بہ پاسِ مروت بہ نامِ محبت
کہاں ان کی بزم طرب کے ہوں قابل　　ہم سا شوریدہ سر تلخ کام محبت

زباں سے وہ کچھ ہی کہے جائیں مجھ کو | نگہ دے رہی ہے پیام محبت
ہٹا لے ارے اپنی مستانہ نظریں | چھلکنے کو ہے میرا جام محبت

چھپ سکیں گے حضور پھر کیونکر | جو تصوّر میں لا کے دیکھ لیا؟
آج میں نے وہ چاند سا مکھڑا | بکھری زلفیں ہٹا کے دیکھ لیا
اب تو چین آگیا تجھے قاتل | خاک دھوں میں لٹا کے دیکھ لیا

مجذوبؔ اپنی حد سے بڑھائیں نہ جذب کے پ | حضرت بہت نہ جلوۂ جاناں سے کھیلئے
لینے ہی دیتا اب نہیں کمبخت دم مجھے | کب تک آپ آہ اس دلِ ناداں سے کھیلئے
میرے دلِ تپاں سے یہ اچھی نہیں ہے چھیڑ | لیے نہ آپ شعلہ بداماں سے کھیلئے

مجذوبؔ کی تیغ زبان کی چمک سب سے زیادہ شیخ و ناصح اور زاہد کے مقابلہ میں نظر آتی ہے۔

یہ سب سوچ کر دل لگایا ہے ناصح! | نئی بات کیا آپ فرما رہے ہیں؟
میں مجذوبؔ ہوں کچھ سمجھئے تو ناصح! | بھلا آپ کس کو یہ سمجھا رہے ہیں

کچھ تو ہو اے شیخ جی تلقین توبہ کا عوض | اور کیا خدمت کریں حضرت یہ حاضر جام ہو

ابر میں تلقینِ توبہ شیخ جی؟ | وقعتِ فرمانِ عالی جائے گی!

رہیے تو کبھی رندوں میں اے شیخ زمانہ — قائل ابھی حضرت کا یہ احقر تو نہیں ہو

اتنے خفا جو آپ ہیں سچ کہیے شیخ جی — ایسے ہی کیا تھے آپ مقدس شباب میں

تشبیہات | حضرت مجذوب میں ادبی اختراع کا بھی مادہ تھا، اس لیے انھوں نے بعض پرانی تشبیہوں کو حسنِ استعمال سے چمکایا ہے اور بہت سی نئی تشبیہیں پیدا کی ہیں، اور ان کی شاعری کی طرح ان کی تشبیہات میں بھی بڑی بلندی ہے بعض مثالیں ملاحظہ ہوں۔

موئے بدن کی تشبیہہ شجر طور سے اور دل کی عرش بریں سے۔

یہ آج تصور میں مرے کون حسیں ہے — ہر مو شجر طور ہے دل عرش بریں ہے

دلِ سوزاں کی تشبیہہ شمع سے اور ارمانوں کی پرداوں سے

بھاگتا ہو دلِ سوزاں عبث ارمانوں سے — جس جگہ شمع گئی گھر گئی پروانوں سے

سودائے سر کی تشبیہہ تاج سے اور داغِ دل کی نگین سے

سر میں مرے سودا ہو کہ ہو تاج میں گوہر — دل میں ہو مرے داغ کہ خاتم میں نگیں ہو

دل کے داغوں کی چراغاں سے،

اے سوز عشق تو نے مجھے داغ کیا دیئے — جیسے چراغ دل میں ہزاروں جلا دیئے

چمن آرائی سے

دلمیں گل عشق نے داغوں کے کھلائے تو بہت — انکی گلگشت کے قابل یہ گلستاں نہ ہوا

دل کی سمندر سے اور دیدۂ تر کی سحاب سے،

یہ دیکھ کر میرا دیدۂ تر سمجھ لو خود حالِ قلب مضطر
کہ ہو گا کس جوش میں سمندر جو یہ تلاطم سحاب میں ہو

چینِ جبین کی موج ہے اور چشمِ خشمگیں کی شراب آتشیں کے جام ہے۔

مجھے اک موج ہے ہو یہ تری چینِ جبیں ساقی　　شرابِ آتشیں کا جام چشمِ خشمگیں ساقی

ایک نادر مرکب تشبیہ:۔

ترساں سوارِ کشتیِ طوفاں رسیدہ ہیں　　ارماں لرز رہے ہیں دلِ بے قرار میں

ڈھلکے ہوئے آنسو کی قطرۂ خارج از مے ہے۔

وہ کیا آنسو ڈھلک جائے جو لے دل دیدۂ تر سے
وہ قطرہ خارج از مے ہو چھلک جائے جو ساغر سے

ابرِ سیاہ کی زلف ہے اور برقِ تاباں کی ساغر ہے۔

فیضِ گل بایں ابرِ سیاہ و برقِ تاباں ہے
کہ در کف ساغر و بر دوش زلفِ عنبریں ساقی

خلعتِ نو،

جنت کو جب چلے ہیں اترا لباسِ تن　　شاخوں کو ملتے ہیں نئے خلعت بہار میں

چشمۂ فیض:۔

اشک باری سی اشک باری ہے　　چشمۂ فیض اُن کا جاری ہے۔

محاکات | محاکات یعنی کسی ظاہری و باطنی کیفیت یا منظر کی ایسی مصوری جس سے اسکی پوری تصویر نگاہ کے سامنے آجائے بڑی مشکل چیز ہے، خواجہ صاحب کا کلام اس سے بھی خالی نہیں ہوا اور جا بجا اسکے نہایت مکمل نمونے موجود ہیں۔

اُن کے یہ دو شعر:۔

چڑھی ہو چھکی ایسی کہ تیور تو دیکھو　　جواں آج پیرِ مغاں ہو رہا ہو

دمکتا ہو چہرہ چمکتی ہیں آنکھیں ‌ ‌ ‌ ‌ بڑھاپے میں بھی جانِ جاں ہو رہا ہے

جو انھوں نے اپنے مرشد کی شان میں کہے تھے، اوپر نقل کیے جا چکے ہیں ان شعروں میں کیفیتِ باطنی سے مرشد کی سرشاری اور اس کے فروغِ جمال کی کتنی مکمل تصویر ہو۔

شاہدہ جمال سے خود رفتگی کی کیفیت :۔

یہ کون آ رہا ہو یہ کون آ رہا ہے ‌ ‌ ‌ ‌ سنبھالو ارے میں گرا جا رہا ہوں

سنبھالو سنبھالو، سنبھالو سنبھالو ‌ ‌ ‌ ‌ گرا جا رہا ہوں، گرا جا رہا ہوں

حیرت کا مرقع :۔

میں ہر سمت پھرتا ہوں کھویا ہوا سا ‌ ‌ ‌ ‌ نہ جانے کسے ڈھونڈتا جا رہا ہوں

کھڑا ہوں میں چپ اس طرح اُن کے آگے ‌ ‌ ‌ ‌ کہ جیسے ابھی کچھ کہا چاہتا ہوں

طریقِ عشق میں احتیاط :۔

طریقِ عشق میں ہم یوں سنبھل سنبھل کے چلے

کہ جیسے ہاتھ میں لبریز جام ہوتا ہے

اس تشبیہ سے رفتار کی احتیاط کی کتنی مکمل تصویر سامنے آ جاتی ہے۔

غلبۂ تصوّر کی کیفیت

کھولے ہوئے آغوش بڑھا اس سے میں ملنے ‌ ‌ ‌ ‌ اتنا تھا تصور کہ میں سمجھا نظر آیا

خواجہ صاحب کا کلام رنگا رنگ پھولوں کا ایسا سدا بہار اور دلکشا چمن ہو کہ اسکی پوری بہار ایک گلدستہ میں نہیں دکھائی جا سکتی۔

دامانِ نگہ تنگ گلِ حسنِ تو بسیار ‌ ‌ ‌ ‌ گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

انتخابِ مجذوب

جو اہلِ عقل ہیں کیا تجھ کو پائیں گے مجذوبؔ!
وہ راز داں سہی، لیکن وہ راز دار نہیں

اُن کو تو نے کیا سے کیا شوقِ فراواں کر دیا
پہلے جاں، پھر جانِ جاں پھر جانِ جاناں کر دیا

طبعِ رنگیں نے مری گُل کو گلستاں کر دیا
کچھ سے کچھ حسنِ نظر نے حسنِ خوباں کر دیا

فکرِ این و آں نے جب مجھ کو پریشاں کر دیا
میں نے سر نذرِ جنونِ فتنہ ساماں کر دیا

دردِ دل نے اور سب دردوں کا درماں کر دیا
عشق کی مشکل نے ہر مشکل کو آساں کر دیا

دل قفس میں لگ چلا تھا، پھر پریشاں کر دیا!
ہم صفیرو! تم نے کیوں ذکرِ گلستاں کر دیا؟

"ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم"
کر کے جراَت اُن سے آج اظہارِ ارماں کر دیا

زلف و رُخ کو ڈھانکئے! یہ بھی کوئی انداز ہے
اس کو حیراں کر دیا، اس کو پریشاں کر دیا

پھونک دی اک روح تو مجھ میں مری ہر آہ نے
دردِ دل نے میری رگ رگ کو رگِ جاں کر دیا

میرے چارہ گر کا تو دیکھے کوئی حسنِ علاج
محو دل سے امتیازِ درد و درماں کر دیا

تلخ کر دی زندگی شورش! تری کچھ حد بھی ہے
اُف مرے ہر زخم کو تو نے نمک داں کر دیا

یہ تری زلفیں یہ آنکھیں یہ ترا نکھرا یہ رنگ
حور کو اللہ کی قدرت نے انساں کر دیا

جن کی اُستادی پہ خود حکمت بجا کرتی تھی ناز
ایک اُمّی نے انھیں طفلِ دبستاں کر دیا

چپکے چپکے اندر اندر تو نے اے شوقِ نہاں!
دل کو میرے رازدارِ حسنِ پنہاں کر دیا

ٹوٹ جاتے کیوں نہ ٹانکے زخم کے دیکھا غضب!
شاملِ بخیہ مرا تارِ گریباں کر دیا

مجھ کو سوجھا بھی تو کیا مجذوبؔ وحشت کا علاج
میں نے دل وابستۂ زلفِ پریشاں کر دیا

نہ سمجھا عمر بھر کوئی کہ میں بھی تیرا بسمل تھا،
لبوں پر تھی ہنسی، زخموں سے گو چھلنی مرا دل تھا
جھکا سر غیر کے آگے نہ دل دنیا پہ مائل تھا،
سروں میں سر مرا سر تھا دلوں میں دل مرا دل تھا
یہ سب مانا کہ وہ سفاک تھا ظالم تھا قاتل تھا
دیا جس کو دیا ہاں، پھر کسی کو کیا؟ مرا دل تھا!
طریقِ عشق میں جو جس قدر گم کردہ منزل تھا
وہ بس اُتنا ہی اے دل خضرِ رہ بننے کے قابل تھا
ہزاروں زخم کھا کر بھی نہ تڑپا ہائے مجبوری!
بس اک تصویرِ بیتابی سراپا تیرا بسمل تھا
بہر صورت تھی اک تکلیف بیماریِ الفت میں
مجھے آسان تھا مرنا مگر پرہیز مشکل تھا
غنیمت ہے کہ مجھ کو قعرِ دریا نے جگہ دیدی
وہاں دوشِ موجِ آب تھا یاں بارِ ساحل تھا
خدا مجذوب کو رکھے سلامت اُس نے چونکایا
جسے منزل سمجھ رکھا تھا وہ اک خوابِ منزل تھا

کسی سے سیکھ لے بلبل سراپا داستاں رہنا
ہے ننگِ عشق حالِ دل کا محتاجِ بیاں رہنا

جہاں رہنا ہمیں دنیا میں وقفِ امتحاں رہنا
کہیں جانا ہمیں ہر پھر کے زیرِ آسماں رہنا
کوئی رہنے میں رہنا ہو یہ زیرِ آسماں رہنا
یہ فکرِ دشمناں رہنا یہ یادِ دوستاں رہنا

یہ کیا طرفہ ادا، طرفہ تماشہ، طرفہ پرداہو
مری آنکھوں میں پھرنا پھر بھی آنکھوں سے نہاں رہنا
خدارا رحم کرلے چارہ گر! اُف کیسی گزرے گی
پڑا ہم کو جو دنیا میں نصیبِ دشمناں رہنا

خلاصہ ہم سے سُن لے کوئی آدابِ محبت کا
دُعائیں دل میں دینا ظلم سہنا بے زباں رہنا
یہی آتا ہے بس یا اور بھی کچھ تم کو آتا ہے؟
اُمیدیں توڑنا دل خون کرنا بدگماں رہنا

سبق آموز اہلِ جاہ ہو، درسِ تواضع ہے
بہ ایں رفعت قدمبوسِ زمیں اے آسماں رہنا
بھروسہ کچھ نہیں اِس نفسِ امارہ کا اے زاہد!
فرشتہ بھی یہ ہو جائے تو اس سے بدگماں رہنا

نہ رہ ناشاد سالک مسلکِ مجذوب پر آجا
اگر ہر حال میں تو چاہتا ہے شادماں رہنا

ہاں مجھے مثلِ کیمیا خاک میں تو ملائے جا
شان مری گھٹائے جا رتبہ مرا بڑھائے جا

کھولیں وہ یا نہ کھولیں در اس پہ ہو تیری کیوں نظر
تو تو بس اپنا کام کر یعنی صدا لگائے جا

دیکھ یہ راہِ عشق ہے ہوتی ہو بس یونہی یہ طے
سینہ پہ تیر کھائے جا آگے قدم بڑھائے جا

ایسا نہ ہو کہیں غضب سرد ہو گرمئ طلب
ہاں مرا غم بڑھائے جا ہاں مجھے آزمائے جا

بیٹھے گا چین سے اگر کام کے کیا رہیں گے پر
گو نہ نکل سکے مگر، پنجرے میں پھڑ پھڑائے جا

جذبؔ میں جب غزل پڑھی، مقطع سے رہ گئی تھی
بزم کی بزم چیخ اٹھی رک نہ ابھی سنائے جا

اداشناس ترا بے زباں نہیں ہوتا
کہے وہ کس سے؟ کوئی نکتہ داں نہیں ہوتا

سب ایک رنگ میں ہیں میکدے کے خورد و کلاں
یہاں تفاوتِ پیر و جواں نہیں ہوتا

قمارِ عشق میں سب کچھ گنوا دیا میں نے
امیدِ نفع میں خوفِ زیاں نہیں ہوتا

سہم رہا ہوں میں اے اہلِ قبر! بتلا دو!!
زمیں تلے تو کوئی آسماں نہیں ہوتا!

وہ محتسب ہو کہ واعظ وہ فلسفی ہو کہ شیخ
کسی سے بند ترا راز داں نہیں ہوتا

وہ سب کے سامنے اس سادگی سے بیٹھے ہیں
کہ دل چرانے کا ان پر گماں نہیں ہوتا

جو آپ چاہیں کہ لے لیں کسی کا مفت میں دل تو یہ معاملہ یوں مہرباں! نہیں ہوتا!

جہاں فریب ہو مجذوب یہ تری صورت
بتوں کے عشق کا تجھ پہ گماں نہیں ہوتا

میں کب چونکا کہ اس محفل میں جب رخصت کا ساماں تھا
یہ لب پر تھا کہ کیا میں بھی شریکِ بزمِ جاناں تھا؟

ازل میں سامنے عقل و جنوں دونوں کا ساماں تھا
جو میں ہوش و خرد لیتا تو کیا کوئی میں ناداں تھا؟

وہ غفلت کیش جب پرسانِ حالِ دردمنداں تھا
تو مشکل تھا یہ کہنا درد تھا دل میں کہ درماں تھا

ادھر ٹکڑے تھا دامن اور اُدھر پرزے گریباں تھا
مگر مانندِ گل میں ان پھٹے حالوں بھی خنداں تھا

چمن میں خاک برسر تھی صبا، گل چاک داماں تھا
دلِ وحشت زدہ کو ہر جگہ وحشت کا ساماں تھا

خبر ہے چھپنے والے کچھ تصور کے تصرف کی؟
یہ وہ آنکھیں نہیں تو پہلے جن آنکھوں سے پنہاں تھا

کسی کی یاد میں آنے بیٹھے جو سب سے بے غرض ہو کر
تو اپنا بوریا بھی پھر ہمیں تختِ سلیماں تھا

ذرا دیکھو تو یہ الٹی رسائی میری قسمت کی
وہ نکلا غیر کے دل سے، جو میرے دل کا ارماں تھا!

جو رُخ بدلا ہے ساقی نے دگرگوں رنگِ محفل ہے
وہ خنداں ہے جو گریاں تھا وہ گریاں ہے جو خنداں تھا

ہوئی تجویز وہ مٹی پئے تخلیق دلِ وحشی
کہ جس مٹی کے ہر ذرّے میں مضمر اک بیاباں تھا

بھلا مجذوب کچھ تو ہوش رکھتے ایسے موقع پر
غضب ہو میزباں بننا پڑا اس کو جو مہماں تھا

ہر چیز میں عکسِ رُخِ زیبا نظر آیا
عالم مجھے سب جلوہ ہی جلوہ نظر آیا

تو کب کسی طالب کو سراپا نظر آیا؟
دیکھا تجھے اتنا جسے جتنا نظر آیا

کیں بند جب آنکھیں تو مری کھل گئیں آنکھیں
کیا تم سے کہوں پھر مجھے کیا کیا نظر آیا

جب مہر نمایاں ہوا سب چھپ گئے تارے
تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

گردوں کو بھی اب دیکھ کے ہوتی ہو تسلی
غربت میں بھی ایک آشنا سا نظر آیا

سب دولتِ کونین جو دی عشق کے بدلے
اس بھاؤ یہ سودا مجھے سستا نظر آیا

ناکام ہی تا عمر رہا طالبِ دیدار
ہر جلوہ ترا بعد کو پردا نظر آیا

جو دور نگاہوں سے سرِ عرشِ بریں ہو
وہ نور سرِ گنبدِ خضرا نظر آیا

مجذوب کبھی سوز کبھی ساز ہو تجھ میں
تو میر کبھی اور کبھی سودا نظر آیا

مجذوب کے جذبے کی جو سمجھے نہ حقیقت
ان عقل کے اندھوں کو یہ سودا نظر آیا

رحم کھا کر وہ کبھی جلوہ دکھا بھی دے گا
جس نے یہ درد دیا ہو وہ دوا بھی دے گا

باریابی کی ہیں شرطوں کا خلاصہ سمجھا
وہی پہونچے گا جو اپنے کو مٹا بھی دے گا

اک جہاں میں دلِ غدّار تھا مشہور وفا
کیا خبر تھی کہ یہ کمبخت دغا بھی دے گا

وعدۂ حشر پہ کیا شاد ہو یہ جانِ حزیں
اس قدر عرصہ تو وعدے کو بھلا بھی دے گا

بے جھجک شوق سے ہاں مرنے پہ ہو جا تیار
بے نشاں کرکے وہ کچھ اپنا پتا بھی دے گا

ہاں کوئی مر تو مٹے اے دلِ ناداں اُن پر
لطفِ الطاف پھر آزارِ جفا بھی دے گا

وہاں بھی کوئی بہہ کر اشک پہونچا ہو مگر اپنا
بہت یاد آرہا ہو آج جو غربت میں گھر اپنا

لگا دے منھ سے خم ساقی کہ ہیں مدت کے پیاسے ہم
نہ ہوگا حلق بھی اس شیشۂ ساغر سے تر اپنا

یہ دردِ لے بدگماں! کچھ دیکھنے کی چیز اگر ہوتی
میں رکھ دیتا ترے آگے کلیجہ چیر کر اپنا

تحیّر، یاس، سوزش، گریہ، نالہ، آہ، غم حسرت
بہلتا ہے انھیں آٹھوں سے دل آٹھوں پہر اپنا

ہمیں مہرِ سلیمانی ہے یہ داغِ جگر اپنا
ہجومِ آرزو لشکر ہے، سودا تاجِ سر اپنا

یہاں آئیں نہ بزمِ غیر میں دل چھوڑ کر اپنا
کٹی جس طرح شب ہو جائے گا دن بھی بسر اپنا

نہ بے دردی سے جا یوں نیم بسمل چھوڑ کر ظالم!
ترے قربان! ہاں اک اور بھی تیرِ نظر اپنا

شبِ وصل اس کو کب کافی ہے روزِ حشر سن لینا!
بہت افسانہ طولانی ہو! قصّہ مختصر!! اپنا

ملامت کر نہ ہم رندوں کو تو اے زاہدِ خود بیں!
بھرا اچھا ترے زہدِ خشک سے دامانِ تر اپنا

تجھے دوں کیا وہاں قبر کچھ چھوڑا بھی ہو غم نے
یہی دو چار سوکھی ہڈیاں ہیں ماحضر اپنا

وہ سودا دے مجھے جس کا اثر جمعیتِ دل ہو
بنا دے اے خدا مجذوب کو آشفتہ سر اپنا

کچھ نہ پوچھو کیا ہوا کیونکر ہوا — جو ہوا جیسا ہوا بہتر ہوا!
کیا بھلا ہو میری مرضی کے خلاف — وہ جو حسبِ مرضیٔ دلبر ہوا
دوست راضی ہو تو پھر کچھ ڈر نہیں — ہو اگر دشمن زمانہ بھر ہوا
جب توقع اٹھ گئی مخلوق سے — مجھ پہ فضلِ خالقِ اکبر ہوا

بند جیب سب در ہوئے میرے لیے — غیب سے پیدا نیا اک در ہوا
حد بھی کچھ اے خامۂ حسرت رقم! — لکھ بھی چک خط کیا ہوا دفتر ہوا

ہو گئے جب راستے مسدود سب
جذب خود مجذوب کا رہبر ہوا

مرے جام و مینا نہیں جام و مینا — یہ ہے قلب روشن وہ ہے چشم بینا
یہ تیرا ہے اے رند! پینے میں پینا — میں ہوں مست ہر دم نہ ساغر نہ مینا

وہ مست ناز آتا ہے ذرا ہشیار ہو جانا — یہیں دیکھا گیا ہو بے پیے سرشار ہو جانا
ہمارا شغل ہو راتوں کو رونا یاد دلبر میں — ہماری نیند ہو محو خیال یار ہو جانا
نگاوٹ سے تری کیا دل کھلے، معلوم ہو ہمکو — ذرا سی بات میں کھنچ کر ترا تلوار ہو جانا
عبث ہو جستجو بحر محبت کے کنارے کی — بس اس میں ڈوب مرنا ہی ہو اے دل پار ہو جانا

نہیں درکار مے ہم کو پیے جا تو ہی اے ساقی!
ہمیں تو مست کرتا ہے ترا سرشار ہو جانا

ادھر دیکھ لینا، ادھر دیکھ لینا — پھر ان کا مجھے اک نظر دیکھ لینا
دکھائیں گی آہیں اثر دیکھ لینا — وہ آئیں گے تھامے جگر دیکھ لینا
غضب ہو غضب ہو اے اُف غضب ہو — ترا مسکرا کر ادھر دیکھ لینا
یہ کرے نہ مجذوب کیوں ہر دم سجدہ — انھیں چار سو جلوہ گر دیکھ لینا

ضبطِ غم سے کشمکش میں دم رہا — زندگی بھر نزع کا عالم رہا
حسن کا روزِ ازل توام رہا — آفتاب اک قطرۂ شبنم رہا
نالہ پر شور اور کبھی مدھم رہا — سازِ دل میں لطفِ زیر و بم رہا
دامنِ مجذوب پھٹ کر اے جنوں! — بادشاہِ عشق کا پرچم رہا

جہاں بدلا تو بدلا تو بھی اے جانِ جہاں بدلا
زمیں بدلی تو بدلی تھی غضب ہے آسماں بدلا

مری دنیائے دل کو تو نے اے پیرِ مغاں بدلا
قیاس اب ہو گیا عرفاں، یقیں سے اب گماں بدلا

طریقِ عشق میں گو کارواں پر کارواں بدلا
نہ لیکن رہگذر بدلی، نہ میر کارواں بدلا

رہا بارِ امانت گو وبالِ دوش رستے بھر
نہ کندھا بھی مگر ہم نے تہِ بارِ گراں بدلا

کروں کیا؟ دل ہے با صد زہد و تقویٰ مائلِ رندی
جبلت کیا بدل سکتی عمل کو اپنے ہاں بدلا

نہ رہ چھوڑی نہ ہم نے نقشِ پائے رہرواں چھوڑے
ہوا کے رخ پہ رخ تو نے تو گردِ کارواں بدلا

بہت گو عشق میں مجذوب بدلا تم نے حال اپنا
مگر جیسا بدلنا چاہیے ویسا کہاں بدلا؟

جلوہ فرما دیر تک دلبر رہا
اپنی کہہ لی سب نے میں ششدر رہا

جسم بے حس بے شکن بستر رہا
میں نئے انداز سے مضطر رہا

میں خرابِ بادہ و ساغر رہا
دل فدائے ساقیٔ کوثر رہا

میں رہا تو باغِ ہستی میں مگر
بے نوا بے آشیاں بے پر رہا

سب چمن والوں نے تو لوٹی بہار
اور مجھے صیاد ہی کا ڈر رہا

کوئی سمجھا رند کوئی متقی
لب پہ توبہ ہاتھ میں ساغر رہا

تھم رہے آنسو رہی دل میں جلن
نم رہیں آنکھیں کلیجہ تر رہا

عمر بھر پھرتا رہا میں دربدر
مر کے بھی چرچا مرا گھر گھر رہا

سینکڑوں فکریں ہیں تم کو عاقلو!
تم سے تو مجذوبؔ ہی بہتر رہا!!

گو بلا سے میں تہِ خنجر رہا
سامنے اس کا رُخِ انور رہا

کیا کہوں دنیا میں میں کیونکر رہا
عمر بھر جینا مجھے دوبھر رہا

کیسے کیسے بُت رہے پیشِ نظر
اللہ اللہ روز و شب لب پر رہا

حالِ دل کہنے کی جرأت کب ہوئی؟
داخلِ دفتر ہی یہ دفتر رہا

کیوں رہا مجذوبؔ بے غم مجھ سے سُن!
بے غرض، بے مدعا، بے زر رہا!

نہ دیکھوں گا حسینوں کو، ارے توبہ نہ دیکھوں گا
تقاضا لاکھ تو کر لے دلِ شیدا! نہ دیکھوں گا!!

کروں ناصح! میں کیونکر ہائے یہ حلّ "نہ دیکھوں گا"
نظر پڑ جائے گی خود ہی جو دانستہ نہ دیکھوں گا

نگاہِ ناز کو تیری میں شرمندہ نہ دیکھوں گا
ہٹائے لیتا ہوں اپنی نظر اچھا نہ دیکھوں گا"

وہ کہتے ہیں "نہ سمجھوں گا تجھے مجذوبؔ جا میں عاشق
کہ جب تک کوچہ و بازار میں رُسوا نہ دیکھوں گا"

بلا سے میں اگر رو رو کے بینائی بھی کھو بیٹھوں
کروں گا کیا ان آنکھوں کو جو وہ جلوہ نہ دیکھوں گا

بُلا سے میرے دل پر میری جاں! کچھ ہی گزر جائے
میں تیری خاطرِ نازک کو آزردہ نہ دیکھوں گا

اُٹھاؤں گا نہ زانو سے میں ہرگز اپنا سر ہمدم!
ارے میں اپنی آنکھوں سے انھیں جاتا نہ دیکھوں گا

حسینوں سے وہی پھر حضرتِ دل! دیدہ بازی ہے!!
ابھی تو کر رہے تھے آپ یہ دعویٰ نہ دیکھوں گا

ذرا اے ناصحِ فرزانہ! چل کر سُن تو دو باتیں
نہ ہوگا پھر بھی تو مجذوبؔ کا دیوانہ؟ دیکھوں گا!

جو آنا ہے اُدھر آج کل کرنے والے! تو بس آج آ! کل نہ بیمار ہوگا
دَمِ آخر اُٹھنے کو ہے چشمِ حسرت سنبھل جاؤ آج آخری وار ہوگا

یہی رسم مدت سے ہو عاشقی میں — جو سر دار ہو گا سر دار ہو گا
یہ سے ہی اے مجذوب ہو ساری حرمت — جو مے خوار سے مے چھٹی خوار ہو گا

ضبطِ اُلفت نے جو بسمل نہ سنبھالا ہوتا

نام رُسوا ترا تا عالم بالا ہوتا
پے ترے حلق میں اے گھونٹ لہو کا ہوتی

دانہ انگور کا منھ میں مرے چھالا ہوتا
کیا ہی اُٹھی ہو گھٹا جھومتی بل کی لیتی

ہائے ایسے میں مرا گیسوؤں والا ہوتا
نگہ شوق نے ڈھلکایا تھا کن جوکھوں سے
کیا بگڑتا جو دوپٹہ نہ سنبھالا ہوتا

ہمیں نصیب کبھی ہائے! آشیاں نہ ہوا
رکھے نہ تنکے کہ نالہ شرر فشاں نہ ہوا

تلاشِ عشق میں جانا کہاں کہاں نہ ہوا؛
کوئی زمیں نہ ملی جس پہ آسماں نہ ہوا

وہ مہرباں تھے کہی سب سے سرگذشت اپنی،
ہمیں نصیب ہی عنوانِ داستاں نہ ہوا

وہ لاکھ عقل کے پُتلے ہوں پھر ہیں دیوانے
جنھیں بہار میں اندیشۂ خزاں نہ ہوا

وہ بچ کے بھی جو چلے غیر سے بغمزہ و ناز
کسی سے کیا کہیں کیا کیا ہمیں گماں نہ ہوا
کرے جو کوئی شکایت تو جائے شکوہ نہیں
ہمیں کو کب یہ دل اپنا وبالِ جاں نہ ہوا

پڑے اُف نہ کمسن حسینوں سے پالا
وہ معصوم نظریں وہ منھ بھولا بھالا
دُہائی ہے دردِ محبت دُہائی
ارے مار ڈالا، ارے مار ڈالا

ہر طرف سر گھما کے دیکھ لیا
پھر مجھے مسکرا کے دیکھ لیا
دھیان میں اُن کو لا کے دیکھ لیا
سب کی نظریں بچا کے دیکھ لیا
اب تو خوب آزما کے دیکھ لیا!
ہم ہیں بندے وفا کے! دیکھ لیا!!
کیں بہت منتیں تو اُف رے غرور
اک نظر منھ پُھلا کے دیکھ لیا
آج میں نے وہ چاند سا مکھڑا
بکھری زلفیں ہٹا کے دیکھ لیا
لُطف ہم نے تری محبت کا
سب کو دشمن بنا کے دیکھ لیا
باز آیا نہ عشق سے مجذوبؔ
سب نے سمجھا بجھا کے دیکھ لیا

زباں ہی پہ ہو بس کلامِ محبت
محبت نہیں یہ ہے نامِ محبت
عطا کر الٰہی بنامِ محبت
کمالِ محبت دوامِ محبت

شکر رنجیاں تلخ کام محبت! ضروری ہیں بہر قیام محبت
ارے اک نظر اس طرف بھی خدارا! بہ پاس مروت بہ نام محبت
محبت کے بدلے محبت ستم ہے نہ لے اُف نہ لے انتقام محبت
زباں سے وہ کچھ ہی کہے جائیں لیکن نگہ دے رہی ہے پیام محبت
چڑھیں دار پر یا چڑھیں طور پر ہم رسائی سے بالا ہے بام محبت
نہ ہوگا ابد تک بھی پورا نہ ہوگا مرا قصۂ ناتمام محبت

بہت دور پہنچا ہو مجذوب پھر بھی
بہت دور ابھی ہے مقام محبت

جو مجذوب کا ہے کلام محبت وہ دنیا کو ہے اک پیام محبت
یہ تھا کون غارت گرِ دین و ایماں؟ ارے لے دیا کس نے نام محبت
کہاں اُن کی بزم طرب کے ہوں قابل یہ شوریدہ سر تلخ کام محبت
محبت کو لازم ہیں رسوائیاں بھی محب ہی نہیں نیک نام محبت

جو مجذوب کے ہاتھ میں ہاتھ دے دو
تو ہوں دم میں طے سب مقام محبت

نہ ہو جائے مختل نظام محبت کہ مجذوب ہی ہو اب امام محبت
وہ دیں جام اور وہ بھی جام محبت تو پی کیوں نہ لیں تشنہ کام محبت
جھکا اس ادا سے کہ بس مار ڈالا پیام اجل تھا سلام محبت
نکلنے کی کوشش میں دونے پھنسوگے یہ اے حضرت دل ہو دام محبت
کبھی اس کے دل میں کبھی اسکے دل میں کہیں پر نہیں ہو قیام محبت

نہیں غیر کی طرح میں بندۂ زر　　میں ہوں بندہ پرور غلامِ محبت
نہ ساقی کا دل توڑ مجذوب پی بھی
کہ ایسی ہو تو بہ حرامِ محبت

وہی آپ کا ہو غلامِ محبت　　کہ مجذوب ہو جس کا نامِ محبت
بتوں میں تو دن رات رہتا ہوں لیکن　　مرا دل ہو بیت الحرامِ محبت
خدا ہی اگر دے تو دولت ملے یہ　　کریں لاکھ ہم اہتمامِ محبت
یہ ہو حشر پر حشر آمد کسی کی　　خرام اور پھر یہ خرامِ محبت
نہ مانو بُرا بے تکی سُن کے باتیں　　یہ مجذوب کا ہو کلامِ محبت
نہ مجذوب سا کوئی دُنیا میں دیکھا
تمامِ جنون و تمامِ محبت
یہ ہوتا ہو رخصت غلامِ محبت　　سلامِ محبت، سلامِ محبت
نہ ٹھکرا سرِ سجدہ کو تو نہ ٹھکرا　　ارے کچھ تو کر احترامِ محبت
بجا ہی سہی! شکوہ پیدا ہی کیوں ہو؟　　کہ یہ بھی ہو اے دل حرامِ محبت
ارے چھوڑ مجذوب چھوڑ اس غزل کو
غضب ہو یہ تکرارِ نامِ محبت

چمکنے لگا سر بسر نور ہو کر　　میں جل جانے والا نہیں طور ہو کر
نہ پاس آؤ اتنے ملو دور ہو کر　　میں کچھ اور کہہ دوں نہ منصور ہو کر
سرِ دار ہو کر سرِ طور ہو کر　　ترے پاس آیا بڑی دور ہو کر

نہ ترساؤ ہر گام پر دور ہو کر　　کوئی ہار نہ بیٹھے نہ مجبور ہو کر
تصور سلامت! تحیر سلامت!　　میں بیٹھا ہوں اپنی جگہ طور ہو کر
بدلنے لگے کروٹیں اہلِ مرقد　　ذرا دور ہو کر! ذرا دور ہو کر!!
یہ کس کے لیے جان دینے چلا ہوں؟　　چلی آ رہی ہو قضا حور ہو کر
عجب اک معمہ سا میں بن گیا ہوں　　نہ مختار ہو کر نہ مجبور ہو کر
چلا آ رہا ہو کھنچا اک زمانہ　　کشش اس قدر! اس قدر دور ہو کر
حدیں عشق کی کر رہے ہیں وہ قائم　　کبھی پاس آ کر کبھی دور ہو کر
اب اتنی رعایت تو اے آسماں ہو　　نئے غم ملیں پچھلے غم دور ہو کر

میں مجذوب ہوں جذبِ الفت سلامت
بچو گے کہاں مجھ سے تم دور ہو کر

دل اسرارِ فطرت سے معمور ہو کر　　رہا میرے پہلو میں مسرور ہو کر
تنِ یاسمیں پر لباسِ مصفّٰی　　وہ آئے ہیں نورٌ علیٰ نور ہو کر
گھٹا ہے کہ اُنڈی چلی آ رہی ہو　　دعا کس نے کی نشے میں چور ہو کر؟
وہ نظروں میں میری کھپے جا رہے ہیں　　سراپا ادا چشمِ بد دور ہو کر
چھپانے کو ہم تم چھپاتے ہیں دونوں　　رہے گا یہ افسانہ مشہور ہو کر
نظر کیا کروں اب سوئے جام و مینا　　تری مست آنکھوں کا مخمور ہو کر

وہ خوش بخت و خوش وقت مجذوب ہیں ہم
غموں میں بھی رہتے ہیں مسرور ہو کر

جب سے بیٹھا ہوں میں راضی بہ مشیت ہوکر
مجھ پہ آفت بھی کوئی آئی تو رحمت ہوکر

بعد مدت کبھی آئے تو قیامت ہوکر
رنج و غصہ میں بھرے غیر سے زحمت ہوکر

ایسے آنے سے نہ آنا ہی بھلا ہے اُن کا
منھ پھلائے ہوئے مجبورِ مروت ہوکر

مژدہ اے اہلِ جہاں تا بہ قیامت مژدہ
آئے دُنیا میں حضور آیۂ رحمت ہوکر

خانۂ دل کی کرے لاکھ صفائی صوفی
ہوگا آباد تو بربادِ محبت ہوکر

کون ہے آج جو مجذوب کا دیوانہ نہیں
نام چمکا مرا بربادِ محبت ہوکر

کریں گے کرم جب وہ دیکھیں گے عاجز
مرا کام نکلے گا دشوار ہوکر

عبادت، ریاضت کرے لاکھ زاہد
مقدس جو ہوگا تو میخوار ہوکر

پہونچتے ہیں سب عشق میں تا بہ ساحل
کوئی ڈوب کر اور کوئی پار ہوکر

بڑے چین میں تھا میں جب بے خبر تھا
پڑا مشکلوں میں خبردار ہوکر

زباں سے اب انکار کیوں ہو رہا ہے
نگاہوں نگاہوں میں اقرار ہوکر

توبہ تو کر رہا ہوں اب توڑ کے جام و شیشہ سب
دیکھئے رہ بھی جائے جب ابر بہار دیکھ کر

عشق پہ مجھ کو چارہ گر شوق سے کہہ برا مگر
بہر خدا بس اک نظر سوئے نگار دیکھ کر

چھیڑ و نہ قدح خوار کو سمجھو تو راز دار کو
ٹوکو نہ دل بیمار کو دست بکار دیکھ کر

پڑتی ہے وقت جور جبیں پر شکن ہنوز
مجذوب خام ہے ترا دیوانہ پن ہنوز

دیکھا ازل کو دہر کو محشر کو خلد کو
نادیدہ ہے وہ رونق ہر انجمن ہنوز

آ آ کے جا رہے ہیں سب ہی اس دیار سے
سمجھے ہو پھر بھی تم اسے اپنا وطن ہنوز

قلب و جگر میں داغ دار ایک اِس طرف ایک اُس طرف
پہلو میں دو ہیں گل عذار ایک اِس طرف ایک اُس طرف

وہ نشر ہیں انوار کے ہم کسب میں انوار کے
ہیں مہر و مہ مشغول کار ایک اس طرف ایک اُس طرف

سیدھی نظر بھی ہے غضب، ترچھی نظر بھی ہے ستم
یہ تیغ دو رکھتی ہے دھار ایک اِس طرف ایک اُس طرف

وہ جا رہے ہیں دیکھتے گاہے اِدھر گاہے اُدھر
چلتے ہوئے کرتے ہیں وار ایک اِس طرف ایک اُس طرف

ہم کو ملی دیوانگی، اُن کو ملی فرزانگی
مجذوب ہم وہ ہوشیار ایک اِس طرف ایک اُس طرف

ہر ہر ادا بتوں کی ہو قاتل برائے دل — آخر کوئی بچائے تو کیونکر بچائے دل
رہنے دو چپ مجھے نہ سنو ماجرائے دل — میں حالِ دل کہوں تو ابھی منہ کو آئے دل
کب تک یہ ہائے ہائے جگر "ہائے ہائے دل" — کر رحم اے خدائے جگر، اے خدائے دل
مجذوب اب کسی سے بھلا کیا لگائے دل — دل آشنائے درد ہو، درد آشنائے دل
ہوتا ہوں محو لذتِ دیدِ فضائے دل — باغ و بہارِ زیست ہیں یہ داغہائے دل
مجذوب تو بھی غیر خدا سے لگائے دل! — عشقِ بتاں ہو بندۂ حق! ناسزائے دل
مجذوب اب کسی سے نہ یارب لگائے دل — پائے تو تیری یاد سے بس چین پائے دل
ان گل رخوں کے رنگ پہ ہرگز نہ جائے دل — جھوٹے یہ پھول ہیں کہیں دھوکا نہ کھائے دل
دم بھر قرار لینے نہیں دیتا ہائے دل — کیسی یہ پڑ گئی ہو مرے سر بلائے دل
اک سیلِ بے پناہ ہو ہر اقتضائے دل — ایسا بھی کوئی ہائے نہ پائے جو پائے دل
اتنا نہ ہوگا کوئی بھی صبر آزمائے دل — سب سے لگائے تم سے نہ کوئی لگائے دل
اب ہو چکی ہو جرم سے زائد سزائے دل — جانے دو بس معاف بھی کر دو خطائے دل

دو لفظوں ہی میں کہہ دیا سب ماجرائے دل / خاموش ہو گیا ہو کوئی کہہ کے "ہائے دل"

کب تک رہوں میں ہائے کشاکش میں مبتلا / قابو عطا ہو دل پہ کہ بس اب اے خدائے دل!

دل جنسِ بے بہا ہو مگر تیرے واسطے / بس اک نگاہِ لطف ہو اے جان بہائے دل

مدت سے میرے پردہ نشیں! تیرے واسطے / خالی کیے ہوئے ہوں میں خلوت سرائے دل

اے درد آج قصہ ہی کر دے تمام تو / کب تک یہ روز روز کے صدمے اُٹھائے دل

پیدا کیا تھا تو نے بتوں کو جو اے خدا! / رکھ دیتا میرے سینے میں پتھر بجائے دل

اُس شوخ دلربا کی ڈھٹائی تو دیکھئے / اپنے بنا لیے ہیں ہزاروں پرائے دل

اُف کس بلا کا حُسن ہے کیسا سنگار ہے / آئینہ دیکھتے ہو کہیں آ نہ جائے دل

مجذوب مست سے تجھے نسبت ہی شیخ کیا
تو پارسائے وضع ہو وہ پارسائے دل

سمجھے بھی کوئی؟ کس سے کہوں حالِ زارِ دل / دل میرا غمگسار ہو، میں غمگسارِ دل

مطلب کا ہوشیار ہو دیوانہ آپ کا / در پہ پڑا وہ لوٹ رہا ہے بہارِ دل

مجذوب! عذرِ دیدہ بتاں یک قلم غلط / آنکھیں تو بس میں ہیں نہ سہی اختیارِ دل

آئینہ بنتا ہے رگڑے لاکھ جب کھاتا ہے دل!
کچھ نہ پوچھو دل بڑی مشکل سے بن پاتا ہے دل
عشق میں دھوکے پہ دھوکے روز کیوں کھاتا ہو دل
اُن کی باتوں میں نہ جانے کیوں یہ آ جاتا ہو دل

رات دن ہے اک ہجوم طالبانِ دردِ دل
خانقاہِ اشرفی ہے یا دکانِ دردِ دل

یہ ہوا ثابت بوقتِ امتحانِ دردِ دل
دردِ دل سمجھے تھے جس کو تھا گمانِ دردِ دل

ہر طرف سے آ رہے ہیں طالبانِ دردِ دل
یہ مری آہ و فغاں ہے یا اذانِ دردِ دل

اضطرابِ دل جو ہو شایانِ شانِ دردِ دل
دل رہے باقی نہ پھر نام و نشانِ دردِ دل

راز اندر راز ہے رازِ نہانِ دردِ دل
دردِ دل ہو جانِ دل جاناں ہو جانِ دردِ دل

سالک ہیں مگر جذب کا رکھتے ہیں اثر ہم
جانا تو کدھر ہم کو ہے جاتے ہیں کدھر ہم

کچھ اس کے سوا کہہ نہ سکے تا بہ سحر ہم
"ٹھہرو کہ ابھی رکھتے ہیں اک عرضِ دِگر ہم"

اُٹھ جائے ابھی کام لیں ہمت سے اگر ہم
اک یوں ہی سا پردہ ہو اُدھر وہ ہیں اِدھر ہم

وہ صبح کو آئیں گے یہ سنتے ہیں خبر ہم
دیکھیں گے انھیں ہم بھی جو دیکھیں گے سحر ہم

دم بھر تو بھلا کوئی نہیں جی کے دکھا دے
کرلائے ہیں جس حال میں اک عمر بسر ہم

خود کو بھی ترے عشق میں ہم غیر ہی سمجھے
جی بھر کے نہ دیکھا کہ لگا دیں گے نظر ہم

اب صبح ہوئی! اب وہ اُٹھے اب وہ سدھارے!!
آثارِ سحر دیکھتے ہیں قبلِ سحر ہم

جو اُن کی خوشی ہے وہی اپنی بھی خوشی ہو
جا دل تجھے چھوڑا کہ جدھر وہ ہیں اُدھر ہم

بہتر سے بھی بہتر تجھے، تم اُس سے بھی بہتر
بدتر سے بھی بدتر جو ہو اس سے بھی بتر ہم

تو ہی سوچ اے فکرِ عالی! وصفِ قامت کیا کریں؟
سرزمینِ شعر میں برپا قیامت کیا کریں؟

مرتے دم اُف کر کے افشا رازِ الفت کیا کریں
عمر بھر کی جانفشانی دم میں غارت کیا کریں؟

بخت ہی بد ہو تو اے شوقِ شہادت کیا کریں
رکھ دیا پیروں پہ سر اب اور منت کیا کریں

جذبِ دل سے ہم انھیں اے چشمِ حیراں کھینچ لائے
اب بھی گر تجھ کو نہ سوجھے تیری قسمت! کیا کریں؟

بس اب ایک ہی آشنا چاہتا ہوں — ہٹو دوستو! راستہ چاہتا ہوں
جو مرضی ہو تیری وہی میں بھی چاہوں — یہی اب تو بس اے خدا چاہتا ہوں
نہیں وصل کی بھی ہوس میرے دل میں — کسی کو میں بے انتہا چاہتا ہوں
جہاں سانس لینے میں ہو آہ پیدا — بس اب کوئی ایسی فضا چاہتا ہوں
مرا سازِ ہستی ہے لبریز نغمہ — کوئی مطربِ خوشنوا چاہتا ہوں

رہوں میں نہ مجذوب بن جاؤں سالک
یہ توفیق اب اے خدا چاہتا ہوں

وفا کر کے اس کا صلا چاہتا ہوں — بڑا ناسزا ہوں سزا چاہتا ہوں
بتوں کو برائے خدا چاہتا ہوں — بسر خم دل مبتلا چاہتا ہوں
رہا عمر بھر چپ میں یوں اُن کے آگے — کہ جیسے کچھ اُن سے کہا چاہتا ہوں
ستائے بھی کوئی تو پائے دُعائیں — گدا ہوں میں سب کا بھلا چاہتا ہوں

بھلاتا ہوں پھر بھی وہ یاد آ رہے ہیں
وہی چاہتے ہیں میں کیا چاہتا ہوں؟

بیاں ادنیٰ سا فیضِ بیعت پیرِ مغاں کر دوں
جو گر جاؤں میں سجدے میں زمیں کو آسماں کر دوں
کرو تم ظلم اور میں ترکِ فریاد و فغاں کر دوں؟
زباں رکھتے ہوئے اپنے کو کیونکر بے زباں کر دوں!

خودی کو بھی فنا کر دوں مٹا دوں بے نشاں کر دوں

اڑا دوں جامۂ ہستی کے پرزے دھجیاں کر دوں

جو میں جوشِ جنوں میں خاک اڑا کر اک فغاں کر دوں

تو گردوں کو زمیں کر دوں زمیں کو آسماں کر دوں

میں اپنے رنگ میں زاہد اگر ذکرِ بتاں کر دوں

تو دم میں کافرِ صد سالہ کو تسبیح خواں کر دوں

ابھی اپنی ترنم ریزیوں سے وہ سماں کر دوں

کہ مُردوں کو زندہ، اور پیروں کو جواں کر دوں

نہ گھبراؤ میں لو اب مختصر ہی داستاں کر دوں

اک آہِ جانستاں میں حالِ شب اپنا بیاں کر دوں

نہ دنیا ہی کے میں لائق نہ عقبیٰ ہی کے میں قابل

کہاں اپنے کو غائب اے زمین و آسماں کر دوں

ذرا ہشیار رہنا شیخ جی میں ہوں وہ مستانہ

نظر میں زاہدِ صد سالہ کو پیرِ مغاں کر دوں

میں گو مجذوب ہوں لیکن بہ فیضِ مرشدِ کامل

نظر میں راہزن کو رہنمائے سالکاں کر دوں

مجھ میں تو سب ہنر سہی تابِ تو ضبط کی نہیں

شرطِ وفا وہاں بھی اور یہاں بھی نہیں

کیسے ہو دردِ دل بیاں اُف ہو نفس فغاں
کچھ ہو کسی کی داستاں میری سی دُکھ بھری نہیں
مال و زر و دل و جگر کر دے سبھی کو وقفِ در
بندگی اور بقیدِ ننگ ہو بندگی نہیں

کچھ بھی ہو عشق میں روا، اتنی بھی بدظنی نہیں
کہتے ہیں وہ "ابھی نہیں"، سنتا ہوں میں "کبھی نہیں"
توبہ تو بار بار کی، بات تھی اختیار کی
توبہ مگر بہار کی آہ کبھی نبھی نہیں

ترے محبوب کی یارب شباہت لے کے آیا ہوں
حقیقت اس کو تو کر دے میں صورت لے کے آیا ہوں

یہ ابر، یہ منظر، یہ ہوائیں، یہ فضائیں
کیا شاہدِ فطرت کی ہیں مستانہ ادائیں،
وہ منتظر اس کے ہیں کہ آنکھیں تو ملائیں
اب حضرتِ مجذوبؔ ذرا ہوش میں آئیں
آئیں تو وہ کیونکر مری پہچان میں آئیں
بے رنگ ہیں، سو رنگ کی لیکن ہیں قبائیں

"آئیں گے نہ اب" لاکھ وہ کہہ کہہ کے یہ جائیں
ممکن ہے نہ آئیں؟ ابھی آئیں وہ پھر آئیں
مجذوبؔ کے ہنسنے پہ نہ جانا کہ یہ حضرت
رونے پہ ہی آجائیں تو دریا ہی بہائیں

دیکھ اہلِ ضبط مضطرب پہلو بدل رہے ہیں
کوہِ گراں بھی اپنی جگہوں سے ٹل رہے ہیں
اب سے تو صاف کر دو انکار ہی تو اچھا
وعدے تمہارے یوں ہی برسوں سے ٹل رہے ہیں
تم دیکھنا یہ چپ بھی لاتی ہے رنگ کیا کیا
سانچے میں میرے دل کے مضمون ڈھل رہے ہیں
مجذوبؔ نے جو بڑ میں دو لفظ بھی نکالے
برسوں وہ سالکوں میں ضرب المثل رہے ہیں

گھٹا ہے، برق ہے، ساقی ہے، مے ہے یار نہیں
بہار تو ہے مگر، حاصلِ بہار نہیں
یہ عشق دل سے ہے اور دل پہ اختیار نہیں
گناہ گار ہوں لیکن قصوروار نہیں
شبِ وصال ہے لیکن ادب ہے مانعِ وصل

سب اختیار ہے اور کچھ بھی اختیار نہیں

زہے نصیب کہ میری نظر بہ فیضِ جنوں
فریب خوردۂ رنگینیٔ بہار نہیں

یہ اپنی حدِ نگہ ہو کسی کی دید کہاں
یہ حسنِ عکسِ نظر ہو جمالِ یار نہیں

کسی کا ہائے دمِ خود کشی یہ آ کہنا
"نہیں نہیں ارے او میرے بیقرار نہیں"

کتابِ عشق کے سارے ورق اُلٹ ڈالے
کہیں یہ مسئلۂ جبر و اختیار نہیں

زمانے بھر میں تو شہرہ ہے میری رندی کا
یں حسبِ شوق مگر پھر بھی بادہ خوار نہیں

جو اہلِ عقل ہیں کیا تجھ کو پائیں گے مجذوب
وہ رازداں بھی ہیں لیکن وہ رازدار نہیں

وہ بیٹھے رہتے ہیں دیکھوں تو بت بنے کب تک
جو بیقرار نہ کر دوں تو بیقرار نہیں

ابھی تو کپڑے بدل کر نہ جاؤ غیر کے گھر
ابھی کفن بھی تو میلا تہِ مزار نہیں

نہ چھیڑ مسئلہ جبر و اختیار نہ چھیڑ
کچھ اختیار ہے جب دل پہ اختیار نہیں

ہوئے کتنے گستاخ گیسو تمہارے
ہٹاتے ہو پھر بھی یہ منہ آ رہے ہیں

دل وصل میں بیتاب ہے، معلوم نہیں کیوں
تشنہ بہ لبِ آب ہے، معلوم نہیں کیوں
بیمار کی قسمت میں ہے معلوم نہیں کیا،
تریاق بھی زہرآب ہو، معلوم نہیں کیوں
مجذوب کو دُھن آج ہے معلوم نہیں کیا
تنہا بصد احباب ہو، معلوم نہیں کیوں

کرم کے بھرے جو میخواریاں ہیں
وہ میخواریاں کیا؟ نکوکاریاں ہیں

نہ لو نامِ اُلفت جو خودداریاں ہیں
بہت ذلّتیں ہیں بڑی خواریاں ہیں

جو آسان سمجھو تو ہے عشق آساں
جو دشوار کرلو تو دشواریاں ہیں
کسی کو کسی سے، کسی کو کسی سے
ہمیں اپنی ہستی سے بیزاریاں ہیں
بُتو! لاکھ منصف بنو، لاکھ عادل
خدا جانتا ہو طرفداریاں ہیں

ہمیں جیب نہ پھیلائیں دامن ملے کیا
اُدھر سے تو ہر دم گہر بار یاں ہیں
نہ گھبرا کوئی دلمیں گھر کر رہا ہے
مُبارک کسی کی دل آزاریاں ہیں
نکما ہوا میں تو مجذوب کیا غم
بڑی کار آمد یہ بے کاریاں ہیں

کوئی جاکر کہے غم کس لیے مجبور کرتے ہیں
وہ دل سے پاس رکھتے ہیں نظر سے دور کرتے ہیں
نہ نکلو شیشۂ دل سنگِ در پہ چور کرتے ہیں
یہی منظور ہے تم کو یہی منظور کرتے ہیں
لگاتے ہو بھلا اے اہلِ فتویٰ کس پہ تم فتویٰ
قواعد شرع کے مجذوب کو معذور کرتے ہیں

سینہ میں جو ہر دم ہے تجلّی کا یہ عالم
کیا عرش معلّٰی اُتر آیا مرے دل میں
او پردہ نشیں میں ترے اس ناز کے قرباں
پنہاں مری آنکھوں سے ہویدا مرے دل میں
اُف اُف رے ستم ہائے تری نیم نگاہی
نکلا بھی نہیں تیر کہ بیٹھا مرے دل میں
ہے عشق مجھے کس لبِ شیریں کا الٰہی
گر درد بھی اُٹھتا ہے تو میٹھا مرے دل میں

نظارے ہوئے ہیں اشارے ہوئے ہیں
ہم اُن کے ہوئے وہ ہمارے ہوئے ہیں

ہمیں تو بھلے لگتے ہیں اور بھی اب
وہ زیور کو اپنے اُتارے ہوئے ہیں

نہیں پاس کچھ ایک دل ہے سو وہ بھی
تمارِ محبت میں ہارے ہوئے ہیں

مزے وصل میں جو اُٹھائے تھے اے دل!
جدائی میں اب وہ ہی آرے ہوئے ہیں

ہمیں ہوش ہے اب کہاں تن بدن کا
کہ مجذوبؔ اُن کے پکارے ہوئے ہیں

کہیں وہ تو دیکھوں نہیں آرہے ہیں
کہ ہم دردِ دل میں کمی پا رہے ہیں

جدھر جذب ہم کو لیے جا رہا ہے
کیے بند آنکھیں چلے جارہے ہیں

یہاں اُن کو آنا نہیں ہو تو پھر کیوں
تصوّر میں آ آ کے تڑپا رہے ہیں

مرے سارے شکوے کیے رد یہ کہہ کر
"بجا آپ ارشاد فرمارہے ہیں"

یہ سب سوچ کر دل لگایا ہو ناصح!
نئی بات کیا آپ فرما رہے ہیں؟

جو ہوں در اصل صورت سے کہاں معلوم ہوتا ہوں
بہارِ بے خزاں ہوں گو خزاں معلوم ہوتا ہوں

بٹھلاتے ہیں جو سر آنکھوں پہ سب اس لئے خوشی کیا ہو
کسی کی طبع نازک پر گراں معلوم ہوتا ہوں
نہ میری بڑ پہ جا مجذوب کی پہچان پیدا کر
سراپا دل ہوں سرتاپا زباں معلوم ہوتا ہوں

پس پردہ تجھے ہر بزم میں شامل سمجھتے ہیں
کوئی محفل ہو ہم اس کو تری محفل سمجھتے ہیں
بڑے ہشیار ہیں وہ جن کو سب غافل سمجھتے ہیں
نظر پہچانتے ہیں وہ مزاجِ دل سمجھتے ہیں
وہ خود کامل ہیں مجھ ناقص کو جو کامل سمجھتے ہیں
وہ حسنِ ظن سے اپنا ہی سا میرا دل سمجھتے ہیں
سمجھتا ہے گنہ رندی کو تو اے زاہد خود بیں
اور ایسے زہد کو ہم کفر میں داخل سمجھتے ہیں
سمجھتا ہے غلط لیلیٰ کو لیلیٰ قیس دیوانہ
نظر والے تو لیلیٰ کو بھی اک محمل سمجھتے ہیں
سڑی، دیوانہ، سودائی جو چاہے سو کہے دنیا
حقیقت ہیں مگر مجذوب کو عاقل سمجھتے ہیں

یہ کیا ہے ترے ہوتے افسردہ ہے میخانہ
ہاں اے دلِ دیوانہ اک نعرۂ مستانہ

کہتا ہوا پھرتا ہے محشر میں یہ دیوانہ
"یارب مرا ویرانہ، یارب مرا ویرانہ"

ہے آمد و رفت اپنی اس بزم میں روزانہ
اک دَر درِ توبہ ہے اک دَر درِ میخانہ

اتنی تو پلا ساقی اب اس سے بھی کیا کم ہو
لبریز تو ہو جائے یہ عمر کا پیمانہ

میں لاکھ چلا پھر بھی پہونچا نہ سرِ منزل
کچھ تو ہی سہارا دے اے لغزشِ مستانہ

ساقی نے بدل ڈالی دُنیا مری ہستی کی
آنکھیں ہیں کہ میخانے دل ہے کہ پری خانہ

دے تاؤ نہ اب اتنا کر آنچ ذرا ہلکی
تیزی پہ ہے مے ساقی! اُڑ جائے نہ میخانہ

مجذوبؔ کو جب دیکھا محفل کی طرف آتے
گھبرا کے پکار اُٹھے "دیوانہ ہے دیوانہ"

یہ کون آیا کہ دھیمی پڑ گئی لَو شمع محفل کی
پتنگوں کی جگہ اُڑنے لگیں چنگاریاں دل کی

بس اب کیا غم کہ سُن لی ہو بشارت پیر کامل کی
سفیرؔ کامیابی ہیں یہی ناکامیاں دل کی

ہمیں تو رات دن اے ہم سفر چلنے سے مطلب ہے
سفر محدود ہو جن کا انھیں ہو فکر منزل کی
کہیں کون و مکاں میں جو نہ رکھی جا سکی اے دل!
غضب دیکھا وہ چنگاری مری مٹی میں شامل کی

کیا کرے اک ساتھ اک دُنیا کی ہے آئی ہوئی
کوئے قاتل میں قضا پھرتی ہے گھبرائی ہوئی
کیا ہوا ہم کو نصیب اس گلشنِ ایجاد سے
اک کلی دل کی ملی سو وہ بھی مرجھائی ہوئی

یوں نظر تو مجھ پہ ڈالی جائے گی — جب میں دیکھوں گا ہٹالی جائے گی
یوں نظر عاشق پہ ڈالی جائے گی — دیکھ کر گردن جھکالی جائے گی
ہائے ایسے میں تو اے ساقی کہاں — کیا بھری برسات خالی جائے گی
آئے گا گر بزمِ مے میں محتسب — اور اک بوتل منگالی جائے گی
غیر کی مانیں گے بے چون وچرا — میں کہوں گا "نی" نکالی جائے گی

آرہا ہے جھومتا وہ مستِ ناز
اب طبیعت کیا سنبھالی جائے گی

زاہدوں پر مے اُچھالی جائے گی — جان ان مُردوں میں ڈالی جائے گی

جس کو تاکوں گا نشیمن کے لیے ۔۔۔ وہی ڈالی کاٹ ڈالی جائے گی
داغِ دل چمکے گا بن کر آفتاب ۔۔۔ لاکھ اس پر خاک ڈالی جائے گی
یاد تیری بڑھتے بڑھتے ایک دن ۔۔۔ تا بہ حد بے خیالی جائے گی
ہم غریبوں کو دیے جائیں گے داغ ۔۔۔ غیر کو پھولوں کی ڈالی جائے گی
سب ترا پردہ دُھرا رہ جائے گا ۔۔۔ جیب ذرا اگر دن جھکالی جائے گی
کر سکے خم بھی نہ جس مے کا سہار ۔۔۔ وہ مرے ساغر میں ڈالی جائے گی
شیخ پینے کا ارادہ تو کرے ۔۔۔ حوضِ کوثر سے منگالی جائے گی

مستیاں مجذوب اب زیبا نہیں
وقعتِ پیرانہ سالی جائے گی

شیخ کی پگڑی اُچھالی جائے گی ۔۔۔ سرکشی سر سے نکالی جائے گی
اور تو نکلیں ہی گے خرقہ سے کام ۔۔۔ اس میں بوتل بھی چھپالی جائے گی
ابر میں تلقینِ توبہ شیخ جی؟ ۔۔۔ وقعتِ فرمانِ عالی جائے گی
کیا رہے گا دل یونہی محرومِ فیض ۔۔۔ کیا یہ جھولی یونہی خالی جائے گی

یہ بن اے مجذوب اُس پر خم کے خم
کب تری بے اعتدالی جائے گی

اندازِ تغافل بھی تو دل کش ہے تمھارا
جھٹ پھیر لیا منھ کو جو بھولے سے نظر کی

اگر ملتی رہے تھوڑی سی دردِ تہ نشیں ساقی
تو بس پھر من و سلویٰ ہے مجھے نانِ جویں ساقی
ہوا اب سرِ وحدت کا مجھے عین الیقیں ساقی
کہ یکساں ہیں مرے دامان و جیب و آستیں ساقی
ترے رندوں پہ سارے کھل گئے اسرارِ دیں ساقی
ہوا علم الیقیں، عین الیقیں، حق الیقیں ساقی
زبردستی لگا دی منھ سے بوتل آج ساقی نے
میں کہتا ہی رہا ہاں ہاں نہیں ساقی نہیں ساقی

الٰہی خیر ہو مجذوب میخانہ میں آیا ہے
قدح کش، لاابالی، جام نازک نازنیں ساقی

گھٹا اٹھی ہے تو بھی کھول زلفِ عنبریں ساقی
ترے ہوتے فلک سے کیوں ہو شرمندہ زمیں ساقی
یہ کس بھٹی کی دی تو نے شرابِ آتشیں ساقی
کہ پیتے ہی رگوں میں بجلیاں سی بھر گئیں ساقی
یہیں سے پاؤں گا ہر نعمتِ دنیا و دیں ساقی
کہیں کیوں جاؤں تیرے میکدہ میں کیا نہیں ساقی

جو تر دامن ہے تیرا پاک دامانوں سے بہتر ہے
گریباں چاک ہے اشکوں سے تر ہے آستیں ساقی

نہ چھیڑ اے محتسب! میں ہوں مئے وحدت کا متوالا

میں وہ مے خوار ہوں جس کے ہیں ختم المرسلیںؐ ساقی

سلامت تیرا میخانہ، سلامت تیرے مستانے

رہے گا رنگ عالم میں یہی تا یوم دیں ساقی

وہی باتیں تو مجذوب اپنی بڑ میں کہہ سناتا ہے

ذرا سنبھلے ہوئے لفظوں میں جو تو نے کہیں ساقی

عجب مشرب ہے تیرا تجھ کو اے مجذوب کیا سمجھیں

کہیں پیرِ مغاں تو ہے کہیں میکش، کہیں ساقی

تصور عرش پر ہے وقفِ سجدہ ہے جبیں میری

مرا اب پوچھنا کیا؟ آسماں میرا زمیں میری

خدارا یوں نہ آ بالوں کو کھولے جھومتا ساقی

ارے نیت نہ ڈانواں ڈول ہو جائے کہیں میری

اُدھر تو در نہ کھولے گا، اِدھر میں در نہ چھوڑوں گا

حکومت اپنی اپنی ہے کہیں تیری، کہیں میری

جو ہارا ہوں کسی سے میں تو ہارا ہوں مقدر سے

جو ٹوٹی ہے کہیں ہمت تو ٹوٹی ہے یہیں میری

جو صورت گیر حسن و عشق کی دنیا کہیں ہوتی

ترے ضو کا فلک بنتا مرے ظل کی زمیں ہوتی

نہیں کرتے ہیں وعدہ دید کا وہ حشر سے پہلے
دلِ بیتاب کی ضد ہے ابھی ہوتی یہیں ہوتی

جو اُن کو دیکھ پاتے ہم تو پھر کیا زندہ رہ جاتے
نگاہِ اولیں اے دل نگاہِ واپسیں ہوتی

جو میخانے میں ہو اُم الخبائث حضرتِ واعظ!
پہونچ جاتی جو حجرہ میں شرابِ الصالحیں ہوتی

ذرا دیکھو تو تم انصاف سے مجذوبؔ کی ہیئت
محبّت کے ریاکاروں کی یہ صورت نہیں ہوتی

اگر تھوڑی سی حُبِّ حق بفیضِ پیر مل جاتی
تو ہاتھ آتی بڑی دولت بڑی جاگیر مل جاتی

سبھی کچھ مجھ کو ملتا یہ دلِ پُر درد کب ملتا
اگر بدقسمتی سے غیر کی تقدیر مل جاتی

اگر مجذوبؔ کا اُن سے کہیں ملنا بھی ہو جاتا
تو ہوتا وصل کیا؟ تصویر سے تصویر مل جاتی

آپ کہتے ہیں کہ رسوا تجھے کرتا ہے یہی
جس طرف ہو کے نکل جائیے چرچا ہے یہی

حسنِ خوباں ہے فدا نازِ بُتاں سر بسجود
تم نے دیکھا مرا بانکا مرا چھیلا ہے یہی

آنکھ لڑتے ہی گئے ہوش کدھر اے ناصح!
اب تمھیں دیکھ لو مجذوب کو سودا ہو یہی

سوگ میں یہ کس کی شرکت ہوگئی
بزم ماتم بزم عشرت ہوگئی
میں بھی نازک طبع وہ بھی تُند خو
خیر یہ گذری محبت ہوگئی
رنج دینے سے وہ باز آئے تو کب!
جبکہ غم کھانے کی عادت ہوگئی

نہا کر تو نہ جانے حُسن کا عالم ہی کیا ہوگا
پسینہ پونچھنے سے جب تری رنگت نکھرتی ہے
گزرتے ہیں ہمارے سامنے سے جب وہ اٹھلاتے
کسی کو کیا خبر دل پر ہمارے کیا گزرتی ہے

چُپکے سے پاس آکے ذرا مُسکرا دیئے
اک اس کرم نے جتنے ستم تھے بھُلا دیئے
مجذوب تو ہے جامع رندی و اتقاء
زاہد بھی تو نے ہم صحبت رنداں بٹھا دیئے

جب دل ہی لگا بیٹھے ہر ناز اُٹھانا ہے
سو بار اگر روٹھیں سو بار منانا ہے

جس طرح بھی ممکن ہو آج اُن کو منانا ہے
گھِس گھِس کے جبیں در پر بگڑی کو بنانا ہے

وہ بارگہِ عالی خود سب سے ہے مستغنی
آئے جسے آنا ہے جائے جسے جانا ہے

جو آگ کی خاصیّت، وہ عشق کی خاصیت
اک سینہ بہ سینہ ہو، اک خانہ بہ خانہ ہے

زخمی بھی کیا کس کو سینے میں چھپے دل کو
شاباش ہے تیر افگن! کیا خوب نشانہ ہے

نہ دل کا تذکرہ تم میرے روبرو کرتے
یہ ذکر چھیڑتے کچھ اور گفتگو کرتے

کہاں کہاں دلِ صد چاک میں رفو کرتے
کہاں تک آہ نہ اظہار آرزو کرتے

دل و جگر کو نہ اپنے اگر لہو کرتے
تو اور کیا ترے ناکام آرزو کرتے

تمھیں کہو کہ اگر عرض کچھ عدو کرتے
تم اختیار یہی طرزِ گفتگو کرتے؟

لحاظِ حُسن کیا میرے جذبِ دل نے ورنہ
زیارتیں مری آ آ کے خوب رو کرتے

بجائے سجدہ بہایا کیے کھڑے آنسو
نماز سب نے پڑھی ہم رہے وضو کرتے

جواب ملتا انھیں اپنی لن ترانی کا
وہ گفتگو تو کبھی ہم سے دو بدو کرتے

یہ حال کیا ہو کہ جب ملنے آئے اے مجذوب!
سُنا تمھیں کسی غائب سے گفتگو کرتے

مجذوبؔ آپ مست ہیں دُنیا ہے آپ کی
کہسار و بحر و باغ و بیاباں سے کھیلئے

یہ کھیل دل کے لینے کے جو کھیلتے ہیں آپ
مجھ سے نہ کھیلئے کسی ناداں سے کھیلئے

مجذوبؔ وجد و رقص میں بس رہیے روز و شب
پی پی کے اب تو گردشِ دوراں سے کھیلئے

جیے یہاں کے لیے یا مرے وہاں کے لیے
اکیلا دم کرے کیا کیا کہاں کہاں کے لیے

سبب نہ پوچھ کہ یہ ابتدا کی باتیں ہیں
فغاں ہی اب تو سبب ہو مری فغاں کے لیے

نہ رازِ حُسن کی تفصیل پوچھ اے ہمدم!
خلاصہ یہ ہے کہ آفت ہو رازداں کے لیے

عصائے آہ لیا، جامۂ فنا پہنا
بتا اے دل! ہیں یہ تیاریاں کہاں کے لیے

نہ بیٹھ مطمئن اے دل! کہ ہے یہ نادانی
وہ امتحاں سے گریزاں ہیں امتحاں کے لیے

اُٹھیں گے حشر میں کہتے ہوئے کہ "ہائے غضب
رہے گا خوب یہ عنوان داستاں کے لیے

نہ سمجھو بڑ اسے مجذوبؔ کی یغور سنو
یہ ایک گنجِ معانی ہو نکتہ داں کے لیے

کسی کے حسن میں اب عشق شامل ہوتا جاتا ہو
بقدر مہر ظالم اور قاتل ہوتا جاتا ہو

خدا پر چھوڑ دو چارہ گرداب مرحلہ میرا
تم آساں کرتے جاتے ہو یہ مشکل ہوتا جاتا ہو

قدم مجذوبؔ کے رکتے نہیں بڑھتے ہی جاتے ہیں
رفیق اک اک جدا منزل بہ منزل ہوتا جاتا ہو

جو تیری یاد فرقت میں مری دم ساز بن جائے
تو میرے دل کی ہر دھڑکن تری آواز بن جائے

ترس کچھ آ چلا صیاد کو ہاں پھڑ پھڑائے جا
یہ شاید صورتِ پرواز ہی پرواز بن جائے

نمایاں ہو نہ چہرے سے نہ آنکھوں سے نہ باتوں سے
محبت راز اندر راز اندر راز بن جائے

حرم سے کرتا ہو کس رند کو شیخ حرم خارج
جہاں میں بیٹھ جاؤں جلوہ گاہِ ناز بن جائے

جو میں ڈالوں نگاہیں حسن میں سب جذب ہو جائیں

کوئی تو ناز بن جائے کوئی انداز بن جائے

نہ اُف بھی میں نے کی پھر بھی جفا کا تیری شہرہ ہے
مرا کیا بس خموشی بھی اگر آواز بن جائے

مسیحا ہو، قضا ہو، یاس ہو، امید ہو، وہ ہوں
کوئی تو چارہ سازِ خاطرِ ناساز بن جائے

پیے تو مے تو یہ تیرا لب بے کیف اے واعظ
لبِ ساغر سے بل بل کر لبِ اعجاز بن جائے

چارہ گر پالا پڑا ہے سخت مشکل سے مجھے
دردِ دل سے دل زیادہ، دردِ دل دل سے مجھے

میزباں گلفام ساقی لالہ رو مے آتشیں
خون آتا ہے نظر اس رنگِ محفل سے مجھے

اُن کے کوچے میں پہونچتے ہی میں بیخود ہو گیا
شوقِ منزل لے کے پہونچا دورِ منزل سے مجھے

ضعف کی کچھ حد بھی ہے یاں زیست کی صورت نہیں
غش پہ غش آتے ہیں اب تو جنبشِ دل سے مجھے

نور تو کیا جانے کیا ہوگا ترا اے جانِ جاں
روشن آتا ہے نظر عالم تیرے ظل سے مجھے

خیر ہے، پردہ نشیں، کیوں آج قصدِ بام ہے؟
آج ارادے کیا ہیں؟ کیا منظور قتلِ عام ہے؟

دم یہاں اُکھڑا ہوا ہے نزع کا ہنگام ہے،
کیا کہی ہے "لو، خدا حافظ، ہمیں اب کام ہے"

میں تو ہوں ہی رند زاہد! پارسا تو بھی نہیں
میں اگر ہوں جام در کف، تو نظر بر جام ہے

دل فقط دے کر تو ہاں تکلیف ہی تکلیف تھی
جان بھی دے دی تو اب آرام ہی آرام ہے

ربط و بے ربطیِ حسن و عشق کیا کیجے بیاں
بام بے زینہ ہے وہ یہ زینۂ بے بام ہے

جذب میں مجذوبِ مستانہ ہے آ کوٹھے پہ آ
قابلِ دید اک تماشہ آج زیرِ بام ہے

قیامت خیز میرا نعرۂ مستانہ ہوتا ہے
نہ چھیڑو چھیڑنے والو! بُرا دیوانہ ہوتا ہے

عبث تو معترض اے ناصحِ فرزانہ ہوتا ہے
مقدر سے کوئی مجذوب سا دیوانہ ہوتا ہے

میں اے پیرِ مغاں جب تک نہیں پیتا نہیں پیتا
مگر پینے پہ آتا ہوں تو خم پیمانہ ہوتا ہے

مگر اے محتسب تجھ کو بھی ہو کچھ ذوق رندی کا؟
کبھی آتا ہے تو جب رنگ پر میخانہ ہوتا ہے
خوشامد میں ہیں سب مجذوب کی وہ رُخ نہیں کرتا
ترے عاشق میں بھی اک نازِ معشوقانہ ہوتا ہے

حقیقت میں تو میخانہ جبھی میخانہ ہوتا ہے
ترے دستِ کرم میں جب کبھی پیمانہ ہوتا ہے
نیا تو یہ مشکن جب داخلِ میخانہ ہوتا ہے
نہ پوچھو پھر جو رنگِ محفلِ رندانہ ہوتا ہے
بظاہر دیکھنے میں ہوتی ہے سج دھج فقیرانہ
دماغ اُن کے گداؤں کا مگر شاہانہ ہوتا ہے
اِدھر لڑتی ہیں نظریں دل اُدھر آپس میں ملتے ہیں
حسینوں سے عجیب انداز پر یارانہ ہوتا ہے
بہار آئی بڑھا سودا خزاں آئی بڑھی وحشت
جو ہوتا ہے بہ پاسِ خاطرِ دیوانہ ہوتا ہے
قیامت ہے ترے مجذوب کا مجنون ہو جانا
وہ جب دیوانہ ہوتا ہے غضب دیوانہ ہوتا ہے

عیاں حالِ دلِ بے بیاں ہو رہا ہے　　　　کہ عاشق سراپا زباں ہو رہا ہے

گھٹا چھائی ہے کیا سماں ہو رہا ہے — فلک پر ہے جوبن جواں ہو رہا ہے

بہار آئی دل شادماں ہو رہا ہے — مگر یہ تہہِ آسماں ہو رہا ہے

وہ نامہرباں، مہرباں ہو رہا ہے — دلِ بدگماں بےگماں ہو رہا ہے

وہ جلوہ تو ہر سو عیاں ہو رہا ہے — حجابِ خودی درمیاں ہو رہا ہے

ترا ذکر وِردِ زباں ہو رہا ہے — یہاں ہو رہا ہے وہاں ہو رہا ہے

عیاں ہو کے پھر وہ نہاں ہو رہا ہے — طلب کا مری امتحاں ہو رہا ہے

محبت بھی کیا عاشقو! ہے تجارت؟ — یہ کیوں ذکرِ سود و زیاں ہو رہا ہے

تصور کی دیکھو تو معجز نمائی — کہ مجھ پر تمھارا گماں ہو رہا ہے

یہ کیوں پڑ رہی ہیں غضبناک نظریں؟ — یہ کیا آج اے مہرباں ہو رہا ہے

کوئی شاید آنے کو ہے پھر مصیبت — دلِ زار پھر شادماں ہو رہا ہے

جوانی ڈھلی مٹ چلے دل کے ارماں — بھرا باغ نذرِ خزاں ہو رہا ہے

پلادی ہے باتوں ہی باتوں میں اتنی — کہ آنکھوں سے دریا رواں ہو رہا ہے

چڑھی ہے کچھ ایسی کہ تیور تو دیکھو — جواں آج پیرِ مغاں ہو رہا ہے

غزلخواں ہوں میں اور وہ کہہ رہے ہیں — "یہ ماتم سا دیکھو کہاں ہو رہا ہے"

دمکتا ہے چہرہ، چمکتی ہیں آنکھیں — بڑھاپے میں بھی جانِ جاں ہو رہا ہے

جبھی کچھ میں کہتا ہوں جب دیکھتا ہوں — کہ دل بھی مرا ہم زباں ہو رہا ہے

میں مجذوب ہوں میری باتیں ہیں سچی — عبث معترض بدگماں ہو رہا ہے

پلادی ہے کس تیز بھٹی کی ساقی

کہ مجذوب آتش بجاں ہو رہا ہے

وہ "ہو حق" اب کہاں؟ افسردہ ہو میخانہ برسوں سے
نہیں قائم ہوئی ہو مجلسِ رندانہ برسوں سے

نہیں ہو اب میسّر صحبتِ جانانہ برسوں سے
غمِ فرقت میں ہوں ویرانیِ خانہ برسوں سے

ہو برگشتہ کسی کی نرگسِ مستانہ برسوں سے
لیے پھرتا ہوں میں اپنا تہی پیمانہ برسوں سے

نہ آئی میری نوبت، وائے ساقی! ہائے محرومی!!
برابر گو ہو گردش میں ترا پیمانہ برسوں سے

بعید انصاف سے ہو غیر کو ترجیح مجھ پہ ہو،
وہ عاشق کل ہوا میں ہوں ترا دیوانہ برسوں سے

بجز عجز و نیاز و بندگی میں اور کیا جانوں
یہ دل ہو زیرِ مشقِ نازِ معشوقانہ برسوں سے

انھیں آخر مری یاد آئی اور اس انداز سے آئی
"نہیں آیا ہو اس جانب مرا دیوانہ برسوں سے"

بس اب آجا! بس اب آجا! کرم فرما، کرم فرما!
صدائیں دے رہا ہو کوئی بیتابانہ برسوں سے

صراحی در بغل، ساغر بکف، مستانہ وار آجا
لگائے آسرا بیٹھا ہو اک مستانہ برسوں سے

دلِ پرشوق روز اس بزم میں اس طرح جاتا ہے
کہ دیکھی ہو نہ جیسے صورتِ جانانہ برسوں سے

کبھی مجنوں سُناتا تھا اور اب مجذوب سے سُن لو
چلا آتا ہو دُنیا میں مرا افسانہ برسوں سے

حضرت دل! کر لیا اپنا انھیں!! — تم تو نکلے یار! جادوگر کھُلے!!
کیا خبر کس وقت ہو کیسی نظر — یوں نہ آ نکلا کرو تم سر کھُلے
مرنے والے کا شبِ غم کون ہو؟ — ہو کفن، جب ماہ کی چادر کھُلے
ہو مزا واعظ بنے پیرِ مُغاں — رازِ میخانہ سرِ منبر کھُلے
نوجوانی تو گنوادی شرم میں — اب کھُلے بھی وہ تو کیا پھر کھُلے
چھپ کے جاتا ہو کہاں کہیئے حضور! — آج کیوں یہ پاؤں کے زیور کھُلے

ملتے ہی سب کہہ سُنایا حالِ دل
ضبط کس کو؟ کون رہ رہ کر کھُلے

نہ آپ جانبِ مستِ شباب دیکھیں گے؟ — جنابِ شیخ تقدس مآب دیکھیں گے!!
جو غور سے خطِ شوقِ آنجناب دیکھیں گے — تو لفظ لفظ میں مضمر کتاب دیکھیں گے

یہ غیر ہو، یہ ہو مجذوب دونوں حاضر ہیں
اب آپ کی نظرِ انتخاب دیکھیں گے

دلرُبا پہلو سے اب اُٹھ کر جدا ہونے کو ہے
کیا غضب ہو، کیا قیامت ہو، یہ کیا ہونے کو ہے

دشمنیٔ خلق میری رہنما ہونے کو ہے
اب مرا دستِ طلب دستِ دُعا ہونے کو ہے

تو نے چاہا تھا بُرا میرا بھلا ہونے کو ہے
آبِ خنجر حلق میں آبِ بقا ہونے کو ہے

آج تو جی بھر کے پی لینے دے اے ساقی مجھے
جان ہی جاتی رہے گی اور کیا ہونے کو ہے

اے دلِ پُر آرزو کر دے سرِ تسلیم خم
دیکھ کن ہاتھوں سے خونِ مدعا ہونے کو ہے

شوخ رفتاری کا اپنی دیکھ تو مُڑ کر اثر
ساتھ ساتھ اُٹھ کر رواں ہر نقشِ پا ہونے کو ہے

اُن سا کوئی ہمدم کوئی دم ساز نہیں ہے
ہر وقت ہیں باتیں مگر آواز نہیں ہے

یہ نغمۂ دلکش مرا بے ساز نہیں ہے
وہ بول رہے ہیں مری آواز نہیں ہے

زاہد! درِ میخانہ بھی ہے کیا درِ توبہ؟
یہ ہر کس و ناکس کے لیے باز نہیں ہے!

ہم خاک نشینوں کو نہ مسند پہ بٹھاؤ
یہ عشق کی توہین ہے اعزاز نہیں ہے

جو کچھ بھی ہے سب عشق کی ہے فتنہ طرازی
ناحق ہے گلہ، حسن فسوں ساز نہیں ہے

ہم تم ہی بس آگاہ ہیں اس ربطِ خفی سے
معلوم کسی اور کو یہ راز نہیں ہے

مجذوبؔ ہوں پیتا ہی چلا جاتا ہوں پیہم
کتنی مجھے پینا ہے یہ انداز نہیں ہے

جی اُٹھے مُردے تری آواز سے
پھر ذرا مطرب اسی انداز سے

انتہا پر ہے نظر آغاز سے
ہوں مخاطب طور کی آواز سے

ہم تو ہونے دیں نہ واقف راز سے
بس چلے بھی دیدۂ غماز سے

اک نظر میں آشیاں گم کردہ کو
بھانپ لیں ہم ہیئتِ پرواز سے

اہلِ محفل فرشِ محفل ہو گئے
بزم میں آئے وہ اس انداز سے

سب نے کر لی حرزِ جاں وردِ زباں
بات جو نکلی لبِ اعجاز سے

ہوش دلبر کا تو اے مجذوبؔ رکھ
بس ارے بس پی مگر انداز سے

نہ خلوت میں بھی رہ سکے ہم اکیلے
کہ دل میں لگے ہیں حسینوں کے میلے

لڑکپن میں ہم عشق کا کھیل کھیلے
وہ تُتلا کے کہنا اُلے لے اُلے لے

جو آ جاؤ خلوت میں یوں تم اکیلے
تو پھر کوئی آغوش میں کیوں نہ لے لے

حسینو! چلو کر دیا مال سستا — جو پہلو میں آ جائے وہ دل کو لیلے
ادھر آ، کلیجے سے تجھ کو لگا لیں — کہ تو بھی اکیلا ہے ہم بھی اکیلے
ارے کل اچانک چلے آنے والے! — بہت آج گھبرا رہے ہیں اکیلے
اب ایسے کو کیا کہہ سکے کوئی ظالم! — جو چپکے ہی سے چٹکیاں دل میں لیلے

ارے کچھ تو مجذوب یاروں کا حق بھی
یہ چھپ چھپ کے پینا اکیلے اکیلے

پار لگ کر بھی ہنوز اے ناخدا! ڈر دل میں ہے
دیر سے ساحل پہ ہوں اور پھر بھی شک ساحل میں ہے
قطعِ راہِ عشق اے رہرو کبھی ممکن نہیں
اک سفر ہے تا بہ منزل اک سفر منزل میں ہے
روک اے بس روک اپنے جذب کو مجذوب روک
عشق بھی ہے کشمکش میں حسن بھی مشکل میں ہے
غیر اور مجذوب کی بابت میں کہہ دوں فیصلہ
فرق بس ان میں وہی ہے جو زبان و دل میں ہے
بند کرائیں نہ منہ مجذوب کا بکنے بھی دیں
ایک اس کے دم سے رونق آپ کی محفل میں ہے

ٹکڑے ٹکڑے ترے ہاتھوں یہ مرا دل ہو جائے
کسی قابل جو نہیں وہ اسی قابل ہو جائے

جو بھی ہونا ہے اِدھر یا اُدھر اے دل ہو جائے
دو بدو آج تو اُن سے سرِ محفل ہو جائے

بے مروت کوئی اتنا بھی نہ اے دل ہو جائے
تھا نہ مٹی میں تو پھولوں ہی میں شامل ہو جائے

اپنے دل کی میں حقیقت کا خلاصہ کہہ دوں
حسرتیں سب کی جو مل جائیں مرا دل ہو جائے

اتنوا اے ضبط یہ آہیں نہیں سانسیں میری
روک لوں ان کو تو جینا مجھے مشکل ہو جائے

سخت جانی ترے قربان بجا اوروں کو
وہ دکھا زور کہ شل بازوئے قاتل ہو جائے

دل ہی دلبر ترا بن جائے یہ پھر اے مجذوب
دل ہی دل میں جو فنا آرزوئے دل ہو جائے

کوئی محرم نہیں سب حال مرا راز میں ہے
ناشنیدہ ہے وہ نغمہ جو مرے ساز میں ہے

کوئی ہو! بندہ ترا اک نگہِ ناز میں ہے
جانے کیا سحر تری چشم فسوں ساز میں ہے

عشقِ پروانہ کا انجام بھی آغاز میں ہے
اس کا ہر مرحلہ طے ایک ہی پرواز میں ہے

بیخودِ شوق یہاں جلوہ گہِ ناز میں ہے
طور پر بحث ابھی صورتِ آغاز میں ہے

مجھ کو جو نوحۂ غم میں ہے وہی ساز میں ہے
گوش زد تیری ہی آواز ہر آواز میں ہے

ہچکیاں بھی مری سن لو مرے نالے تو سُنے
ٹھہرو اک نغمہ ابھی اور مرے ساز میں ہے

حُسنِ اخفا اسے سمجھوں کہ کہوں حُسنِ طلب
راز داں ہو کے بھی دل جستجوئے راز میں ہے

جان رگ رگ سے کھنچی آتی ہو کانوں کی طرف
کس قیامت کی کشش اُف تری آواز میں ہے

ناحق الزام انا الحق کا ہے منصور کے سر
لب پہ مطرب کے جو نغمہ ہو وہی ساز میں ہے

بات کو تم نے بڑھا رکھا ہے ناحق اتنا
فیصلہ ایک نگاہِ غلط انداز میں ہے

لاکھ اُٹھا اب کہیں اُٹھتا ہو یہ مجذوب کا سر
سجدہ مچلا ہو ترے در پہ جبیں ناز میں ہے

پابندِ محبت کبھی آزاد نہیں ہے ۔ اس قید کی اے دل کوئی میعاد نہیں ہے
کیا نزع کے عالم میں ہی کھنا ہو ہمیشہ ۔ کیوں کچھ لبِ جاں بخش سے ارشاد نہیں ہے

مجذوب سے مدہوش کے لب پر ہیں حقائق
یہ کیا ہو جو اللہ کی امداد نہیں ہے

بنا رکھی ہے مجذوب اپنی حالت کیوں خراب ایسی
تری صورت تو یہ اچھی بھلی معلوم ہوتی ہے

میں ہوں اور حشر تک اس در کی جبیں سائی ہے
سرِ زاہد نہیں یہ سر، سرِ سودائی ہے
خانۂ دل میں عجب انجمن آرائی ہے
رشکِ بزمِ دو عالم مری تنہائی ہے
میں نے کمبخت طبیعت ہی عجب پائی ہے
جس طرف آئی ہو یہ، ہو کے بلا آئی ہے
میں ہی محروم ہوں اک خلق تماشائی ہے
کیا غضب ہائے یہ اے ذوقِ جبیں سائی ہے
دل ازل سے ہی کوئی آج کا شیدائی ہے
تھی جو اک چوٹ پرانی وہ ابھر آئی ہے
تھے کہاں گردشِ تقدیر کہاں لائی ہے
بادہ پیمائی تھی، یا بادیہ پیمائی ہے
بزمِ عالم میں عجب مردہ دلی چھائی ہے

جام و مینا ہے نہ جامی ہے نہ مینائی ہے
رنگ رلیوں پہ زمانے کی نہ جانا اے دل
یہ خزاں ہے جو بہ انداز بہار آئی ہے
نازِ تقویٰ سے پھر اچھا ہے نیازِ رندی
جاہِ زاہد سے پھر اچھی مری رسوائی ہے
اللہ اللہ ترے آتے ہی اشکوں کا ہجوم
حسرتِ دید بھی مشکل سے نکل پائی ہے
کبھی دلدادہ تمنّا کا تمنائی تھا
اب تمنّا متمنّیٔ تمنّائی ہے
ایک مدت ہوئی توبہ کیے پھر بھی ہے یہ حال
آنکھ ساغر کو تہی دیکھ کے بھر آئی ہے
حسن خود حسن ہوا تیرے حسیں ہونے سے
روئے زیبا ترا خود زینتِ زیبائی ہے
"ہیچ آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی را"
اس کے برعکس مری کیوں شبِ تنہائی ہے
قدر مجذوب کی خاصانِ خدا سے پوچھو
شہرتِ عام تو اک قسم کی رسوائی ہے
ساری دنیا کی نگاہوں سے گرا ہے مجذوب
تب کہیں جا کے ترے دل میں جگہ پائی ہے

یکا یک کھل گیئں آنکھیں جو بزم یار میں آئے
اُٹھے پردے ہٹیں تاریکیاں انوار میں آئے

غزلخواں، شادماں رقصاں گہے گریاں گہے خنداں
عجب انداز سے ہم کوچۂ دلدار میں آئے

مقام وجد ہو لے دل مگر جائے ادب بھی ہے
بڑے دربار میں پہونچے بڑی سرکار میں آئے

ادھر ہیں رند مستی میں اُدھر ہیں وجد میں صوفی
مزے ہر رنگ والے کو مرے اشعار میں آئے

چھڑا کر جان اپنی بے طرح مجذوب بھاگا ہے
خدا ہی ہے جو اب وہ لوٹ کے گھر بار میں آئے

بس چلا چل قطع راہِ عشق اگر منظور ہے
یہ نہ دیکھ اے ہمسفر! نزدیک ہے یا دور ہے

اُف بھی کر سکتے نہیں نالوں کا کیا مذکور ہے
جیسے ہم مجبور ہیں بلبل کہاں مجبور ہے

وہ بھی دن تھے اے رقیبو! ہم تھے منظور نظر
عرض تم کرتے تھے ہم کہتے تھے نامنظور ہے

خزاں کے درد دکھائے فلک ہزار مجھے
بنا دیا ہے کسی نے سدا بہار مجھے

جو آ گئے ہو مرے گھر تو جا نہیں سکتے
جب اختیار تھیں تھا اب اختیار مجھے

گم گشتۂ حسرت کوئی مجھ سا بھی نہیں ہے
میں خود ہوں کہیں، دل ہو کہیں، ہوش کہیں ہے

گردش کا یہاں کچھ اثر اے چرخ نہیں ہے
جسم اپنا کہیں بھی ہو، مگر دل تو وہیں ہے

وہ بُت کبھی ہے اور کبھی پہلو میں نہیں ہے
مجھ سا بھی کسے جنت و دوزخ کا یقیں ہے

یہ آج تصور میں مرے کون حسیں ہے
ہر مو شجرِ طور ہے، دل عرش بریں ہے

غفلت کا نہیں وقت دمِ بازپسیں ہے
آ جا کہ کوئی ہجر میں مرنے کے قریں ہے

سب ہیچ ہیں سب ہیچ ہیں یہ عیش کے ساماں
جب تو ہی نہیں گھر میں تو پھر کچھ بھی نہیں ہے

سر میں مرے سودا ہو کہ ہے تاج میں گوہر
دل میں ہو مرے داغ کہ خاتم میں نگیں ہے

جو چیز سرِ راہ پڑی پائی تھی تم نے
مجھ کو تو دکھاؤ وہ مرا دل تو نہیں ہے

ہم خوب سمجھتے ہیں تجھے اے چشمِ گرداں
صورت ہے تو اصنع کی تو اصنع یہ نہیں ہے

آجاتے ہیں بے پردہ حسیں یوں مرے آگے
جیسے مری آنکھیں ہی نہیں دل ہی نہیں ہے

دُگدھے میں مرا دل ہے پڑا ہوں چہ کنم میں
آنکھوں سے تو اقرار ہے اور لب پہ نہیں ہے

وہ اُٹھ بھی گئے بزم سے کب کے مگر اب تک
اللہ ری حیرت جو جہاں تھا وہ وہیں ہے

اب میری زیارت کو چلی آتی ہے دنیا
آئینہ کسی کا یہ مرا داغِ جبیں ہے

تھا عالمِ بالا میں تو گردش میں فلک تھا
اب حبیب سے میں دنیا میں ہوں گردش میں زمیں ہے

ہر وقت ہے پیشِ نظر اک حسن کی دُنیا
اب تو ہے جو آنکھوں میں تو ہر چیز حسیں ہے

اتنے کہیں آسودہ تہ خاک نہ ہوں گے
محشر کے تو قابل اسی کوچہ کی زمیں ہے

فریاد کہ اک بندۂ حق کوئے بتاں میں
آوارہ دل، آوارہ سر، آوارہ جبیں ہے

اعدا تو پھر اعدا ہیں، بلا دوست بھی ایسا

جو دشمنِ دل، دشمنِ جاں، دشمنِ دیں ہے
تیوری ہی چڑھی رہتی ہو ان کی مرے آگے
وہ چیں بہ جبیں کیا مری تحریرِ جبیں ہے
ذروں پہ ہیں جوشِ غضب و شوقِ شہادت
لاشہ تو کہیں، سر کہیں، تلوار کہیں ہے
پردے ہی سے ہو تابِ نظر ہم کو میسّر
پردہ ہی ترا پردہ درِ پردہ نشیں ہے
کچھ بھی نہ ہو اک تو ہو تو سب کچھ ہو مرے پاس
سب کچھ ہو مگر تو نہ ہو تو کچھ بھی نہیں ہے
ناصح مری حالت پہ نہ کر ہائے ملامت
کر شکر مرا دل ترے پہلو میں نہیں ہے
کھویا ہوا تکتا ہو بس ایک اک کی نظر کو
مجذوبؔ تری بزم میں ہو بھی تو نہیں ہے

نزع میں کچھ خاطرِ بیمار کرنا چاہیے
اب تو پورا وعدۂ دیدار کرنا چاہیے
اختیار اب شیوۂ اغیار کرنا چاہیے
عرض جب بیکار ہو اصرار کرنا چاہیے

ادا یہ دیکھ کے عاشق کو جھینپ جانے کی
حضور! رکھتی ہے رسوائیاں زمانے کی

کسی اور عالم میں پہنچے ہوئے ہیں — جہانِ خودی سے گزر جانے والے
تجھے زیب و زینت کی حاجت ہی کیا ہے — نظر میں سما کر سنور جانے والے!

جہاں میں ہر سو ہے اس کا جلوہ، کہاں نہیں ہے کدھر نہیں ہے
وہ ذرے ذرے میں جلوہ گر ہے، مگر کوئی دیدہ ور نہیں ہے
ہنسی بھی ہے میرے لب پہ ہر دم اور آنکھ بھی میری تر نہیں ہے
مگر جو دل رو رہا ہے پیہم کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

حسب ذیل غزل کو مجذوب کی آخری غزل قرار دیا جاتا ہے جو پیر و مرشد کے وصال کے بعد کہی گئی تھی۔

حال میں اپنے مست ہوں غیر کا ہوش ہی نہیں
رہتا ہوں میں جہاں میں یوں جیسے یہاں کوئی نہیں
کوئی مزا مزا نہیں، کوئی ہنسی ہنسی نہیں
تیرے بغیر زندگی موت ہے زندگی نہیں
اس دلِ زار سے مقرِ عشق میں جیتے جی نہیں
رونا ہے مجھ کو عمر بھر غم مرا عارضی نہیں
پیرِ مغاں کا دم کہاں اس کی وہ بزم جم کہاں

بادہ نہیں تو ہم کہاں زیست یہ زیست ہی نہیں

جائیں بچشمِ نم کہاں روئیں اب اپنا غم کہاں
پہلے سے اب کرم کہاں ایسا تو اب کوئی نہیں

ہجر کی شب عجب ہو شب حال یہ کیا ہو للعجب
تارے ہیں روشنی نہیں چاند ہو چاندنی نہیں

شیشہ ہے جام ہو نہ خم اصل تو رونقیں ہیں گم
لاکھ سجا رہے ہو تم، بزم ابھی سجی نہیں

کتنا ہی تو بڑا سہی یہ بھی ہے زاہد آگہی
سمجھے جو خود کو منتہی وہ ابھی مبتدی نہیں

حسن کی بارگاہ ہو سہل کوئی نباہ ہے
آہ بھی اک گناہ ہو، عشق بھی دل لگی نہیں

بیٹھا ہوں میں جھکائے سر نیچی کیے ہوئے نظر
بزم میں سب ہی مگر وہ جو نہیں کوئی نہیں

اُن کی محبت آہ میں شوق بھری نگاہ میں
یعنی ابھی ہو راہ میں دل میں ابھی بسی نہیں

اے مرے باغِ آرزو کیا ہو باغ ہائے تو
کلیاں تو گو ہیں چارسو کوئی کلی کھلی نہیں

دل میں لگا کے اُن کی لَو کر دے جہاں میں تشر ضو
شمعیں تو جل رہی ہیں نئو بزم میں روشنی نہیں